عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

جولائی ۱۹۷۱ء

یادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

مرتب
اخوند زادہ حسین امام

بدل اشتراک (نقد پیشگی)
سالانہ پانچ روپیہ 5/
ششماہی تین روپے 3/
فی پرچہ آٹھ آنے

جلد (۴) شمارہ (۷)

جمادی الثانی سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق جولائی سنہ ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۱-۸
دو باتیں	از جناب مولانا مشتاق احمد صاحب افغان فاضل دیوبند مولوی فاضل	۹ - ۲۶
مسلمان اور سائنس	از جناب ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۲۷-۴۶
حقائق و عبر	ادارہ	۴۷-۵۹
ایمان بلا عمل	از جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز	۶۰-۶۸
رومی، نطشے اور اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ	۶۹-۸۴

دورِ حاضرہ کی عظیم الشّان کتاب

"معارف القرآن"

(از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز مدظلہٗ)

یعنی حقائق قرآنی کا دائرۃ المعارف۔ جو اس اصول پر مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور تکمیل شرف انسانیت کے لئے مکمل اور واحد ضابطہ حیات ہے۔

اس کی ترتیب

کے متعلق یوں سمجھئے کہ قرآن کریم سے متعلق کوئی مسئلہ آپ کے ذہن میں آئے۔ پوری کی پوری قرآنی تعلیم۔ ایک دلکش۔ مربوط مضمون کی صورت میں آپ کے سامنے ہو۔

جلد اوّل

شائع ہو چکی ہے۔ بڑی تقطیع ۲۲×۲۹ کے ۵۰۰ صفحات پر مشتمل۔ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت جلد اعلیٰ درجہ کی قیمت

بلا جلد ——— پانچ روپیہ ۵/- ——— محصول ڈاک ۱۲/

مجلد ——— ساڑھے چھ روپیہ ——— محصول ڈاک عمر

کتاب کا مقدمہ علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ کے تبحر علمی کا آئینہ دار ہے جس میں علم تفسیر پر بالخصوص محققانہ بحث کی گئی ہے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام دہلی

لمعات

(۱) ہر نیا سورج مسلمان کے لئے ایک تازہ مصیبت کا پیغام ہوتا ہے۔ ایسی مصیبت جو اسے موت و حیات کی ہولناک کشمکش میں گرفتار کر دیتی ہے۔ وہ مصیبت جہاں دوائیں بے اثر ہو جاتی ہیں۔ زبان خاموش۔ لب بند۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں۔ چاروں طرف سے مایوس۔ آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں ہم نے قوم نوح کی غرقابی کی داستانیں سنیں۔ عاد و ثمود کی ہلاکت و بربادی کے عبرت انگیز قصے سامنے آئے۔ فرعون اور اس کے ساتھیوں کا انجام سننے میں آیا۔ بنی اسرائیل کی غلامی و پریشان حالی کی دردناک کوائف ہم تک پہنچے۔ ان سب کو سنا۔ دیکھا نہیں۔ لیکن جو کچھ دیکھا اس نے وہ سب کچھ بھلا دیا جو سنا تھا کہ بالآخر

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

سنا ہم نے یہ کہ ایک گرجتا۔ بپھرتا۔ اُمنڈتا۔ سیلاب آیا اور قوم کی قوم کو بہا کے لے گیا۔ رات کو سوتے میں ہیبت انگیز طوفان باد و باراں نے چاروں طرف سے گھیرا اور صبح اٹھ کر دیکھا تو آبادیاں یوں ویرانے بن چکی تھیں۔ کانہ لم یکن شیئاً مذکورا۔ عذاب آیا اور ایک ثانیہ میں فنا کر کے چل دیا۔ قصہ ختم ہوا۔ مصیبت کٹ گئی۔ قوم مٹ گئی۔ اس کی جگہ دوسری قوم نے لے لی۔ لیکن ایک عذاب یہ ہے کہ صدیوں سے قوم ذلت و رسوائی۔ بے کسی و بے بسی غلامی و محکومی افلاس و بیچارگی۔ تشتت و انتشار کی لعنت میں گرفتار ہے اور اپنے تڑپنے کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ نہ زندگی نصیب ہوتی ہے نہ موت آتی ہے۔ یہ عذاب تمام عذابوں سے سخت اور یہ مصیبت تمام مصیبتوں سے زیادہ جانکاہ ہے ؎

یہ سسک سسک کے مرنا غم ہجر میں بلا ہے ۔۔۔ کوئی ظلم مجھ پہ ہوتا، مگر ایک بار ہوتا

اس میں شبہ نہیں کہ بنی اسرائیل (یہود) کے عذاب کی مدت بھی بہت لمبی تھی (اور وہ سلسلہ اب تک چلا جا رہا ہے) لیکن اپنی تمام رسوائیوں کے ساتھ انھوں نے دولت کے انبار جمع کر رکھے تھے جس کے بل بوتے پر وہ بڑی

نہ کریں۔ اور اپنی امن پسندی سے اپنی تنظیم کرتے رہیں نہ کسی سے الجھاؤ پیدا کریں نہ تصادم۔ خود اس جماعت کے ارباب حل وعقد نے بھی یہی تلقین کی ہے اور جہاں تک ہمارے علم میں ہے۔ لاہور کے واقعہ کے بعد خاکساروں نے من حیث الجماعت قانون شکنی سے احتراز کیا ہے۔ ان کا آخری پروگرام یہ تھا کہ خاکسار کچھ دنوں کے لئے مساجد میں اعتکاف کریں جس سے ان کا تزکیۂ نفس ہو۔ وہاں اپنی حالت کی اصلاح اور اپنے امیر کی رہائی کے لئے بحضور رب العزت دعائیں مانگیں اور اپنی جماعت کے صحیح مقاصد کی وضاحت سے ان غلط فہمیوں کو دور کریں جو ان کی طرف سے مسلمانوں کے اندر پیدا ہو گئی ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس پروگرام کے اندر کونسا عظیم الشان خطرہ تھا جس کی بنا پر حکومت کو ان کے خلاف ایسے سخت اقدام کی ضرورت پیش آگئی۔ حکومت نے اس باب میں جو منشور شائع کیا ہے اس میں لکھا ہے کہ

> "خاکساروں کے نقیب یعنی اخبار الاصلاح میں اعلان شائع ہوا جس میں تمام خاکساروں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ۶ جون کو نماز جمعہ سے پہلے وردی اور بیلچہ سمیت۔ دہلی۔ لاہور۔ پشاور۔ حیدرآباد اور ناگپور کی مساجد میں کچھ مذہبی رسوم کی ادائگی کے لئے داخل ہوں اس کے تھوڑے عرصہ بعد۔ حکومت ہند تک یہ قابل اعتماد خبر پہنچی کہ مساجد میں یہ بظاہر پُر امن داخلہ۔ درحقیقت کسی طرح کی منظم قانون شکنی کے لئے ایک آڑ ہے اور یہ کہ خاکساروں کا ایک طبقہ اس بات کا حامی ہے کہ قانون شکنی کے ذریعے حکومت کو مجبور کر دیا جائے کہ علامہ (مشرقی) کو رہا کر دے"۔ (ہندوستان ٹائمز ۶ جون ۱۹۴۳ء)

آگے چل کر لکھتا ہے

> "ان وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر پہلے آچکا ہے حکومت ہند کو اس امر کا اطمینان ہو گیا ہے کہ (خاکساروں) کا مجوزہ اقدام۔ خواہ وہ بظاہر کیسا ہی معصوم کیوں نہ نظر آئے درحقیقت قانون اور ضبط میں مداخلت کا مقصد لئے ہوئے ہے اور اس لئے امن عامہ کے لئے باعث خطرہ ہے"۔

یہ ہے وہ جرم جس کے پاداش میں تمام جماعت خاکساران کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم آنا دریافت کر سکیں کہ وہ کونسے قابل اعتماد ذرائع تھے جن سے حکومت کو معلوم ہو گیا کہ خاکساروں کا مساجد میں داخلہ ایک منظم قانون شکنی کی سازش اور امن عامہ کی شکست و ریخت کے لئے مقدس کتاب ہے لیکن اگر ایسا تھا

بھی تو اس کا علاج تو اتنا ہی کافی تھا کہ اعلان کر دیا جاتا کہ خاکساروں کا مساجد میں داخلہ خلاف قانون متصور ہوگا اور اس کے بعد جو خاکسار اس حکم کے خلاف ورزی کرتا اسے سزا دی جاتی۔ ایک "اطلاع" کے بنا پر جو ہو سکتا ہے کہ غلط بھی ہو۔ تمام کی تمام جماعت کو خلافِ قانون قرار دینا۔ ہمارے خیال میں کسی صورت میں حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ذرا غور کیجئے اس وقت جنگ کا مسئلہ حکومتِ برطانیہ اور حکومتِ ہند دونوں کے لئے وقت کا نازک ترین سوال ہے۔ اس کے لئے الگ ضابطہ قوانین نافذ کیا گیا ہے۔ ہر ممکن تدبیر کی جا رہی ہے کہ جنگ کی کوششوں میں کسی قسم کی مزاحمت نہ ہونے پائے۔ لیکن اسی ملک میں ایک جماعت (کانگرس) موجود ہے جو علانیہ ریزولیوشن پاس کرتی ہے کہ چونکہ حکومت نے ہمارے فلاں فلاں مطالبات پورے نہیں کئے اس لئے جنگ میں مزاحمت پیدا کر کے حکومت کو مجبور کیا جائے کہ وہ ہمارے مطالبات منظور کرے۔ صرف ریزولیوشن پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا۔ بلکہ عملاً قانون شکنی کی جاتی ہے جنگ کے خلاف تقاریر ہوتی ہیں نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔ مظاہرے ہوتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں جیل خانے بھیجے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک مدت سے ہو رہا ہے۔ لیکن آج تک حکومت نے کانگرس کی جماعت کو خلافِ قانون قرار نہیں دیا۔ پھر یہی نہیں کہ یہ سب کچھ انفرادی طور پر ہو رہا ہو۔ اس کے لئے ایک منظم طریق عمل اختیار کیا گیا ہے صوبوں سے فہرستیں مرتب ہوتی ہیں۔ وہ فہرستیں گاندھی جی کے پاس جاتی ہیں وہ اپنے مرکز میں بیٹھے قانون شکنی کرنے والوں کا انتخاب کرتے ہیں انھیں ہدایات بھیجتے ہیں۔ لوگوں کو اس کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ اس تمام خلاف قانون نظام کی کاروائیاں اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ حکومت کے سامنے ہو رہا ہے لیکن نہ کانگریس خلاف قانون جماعت قرار دی گئی ہے نہ اس تحریک کے قائد سے کوئی باز پرس ہوتی ہے۔ حکومت نے اپنے مولہ بالا منشور میں علامہ مشرقی کے متعلق لکھا ہے کہ "اس جماعت کا مسلمہ لیڈر ہونے کی بنا پر پنجاب کے واقعات کی نسبت اپنی ذمہ داری سے انکار نہیں کر سکتے" یعنی اگرچہ وہ پنجاب کے واقعات میں براہِ راست شریک نہ تھے اور نہ ہی کوئی ایسی بات پایۂ ثبوت کو پہنچ سکی ہے جس سے معلوم ہو کہ وہ تصادم علامہ مشرقی کے حکم سے سرزد ہوا تھا بایں ہمہ چونکہ وہ اس جماعت کے مسلمہ لیڈر ہیں اس لئے وہ ان واقعات سے بری الذمہ نہیں قرار دئے جا سکتے اور اسی بنا پر وہ محبوس بھی کئے گئے ہیں اس کے برعکس گاندھی جی اس تحریک قانون شکنی کے براہِ راست ذمہ دار اور پورے کرتا دھرتا ہیں۔ لیکن حکومت نے ان کی طرف انگلی نہیں اٹھائی۔ بالآخر ان دونوں جماعتوں میں یہ تفریق کیوں ہے؟

اس کی تو ایک ہی وجہ نظر آتی ہے کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے اور خاکسار اس سوختہ بخت قوم سے متعلق ہیں جنکا آج کوئی والی وارث نہیں -

پھر ایک اور حقیقت بھی غور طلب ہے حکومت نے اعتراف کیا ہے کہ خاکساروں نے قانون شکنی کی نہیں بلکہ ان سے قانون شکنی کا احتمال تھا یعنی انھیں بناء بر احتمال خلافِ قانون قرار دیا گیا ہے - اس کے برعکس خود حکومت کے کئی ایک مجسٹریٹوں نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ کسی شخص کا یہ نوٹس دینا کہ میں جنگ کے خلاف تقریر کروں گا - یا نعرہ لگاؤں گا - اعلان ورزی قانون نہیں ہے جب تک اس سے یہ عمل سرزد نہ ہو جائے اُسے سزا نہیں دی جا سکتی یعنی وہاں یہ حالت کہ ارتکاب جرم کا نوٹس دیدینا بھی کوئی جرم نہیں اور یہاں یہ عالم کہ محض احتمال کی بناء پر تمام جماعت کی جماعت خلاف قانون قرار دیدی جاتی ہے - بہرحال یہ تو رموز سلطنت ہیں جسے ارباب سلطنت ہی سمجھ سکتے ہیں - ہم اس کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں

میری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی　　　　میں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں

سوال یہ ہے کہ اس کے بعد کیا ؟ حکومت کے اعلان کے بعد جماعت خاکساراں کے ناظم اعلیٰ کا ایک تفصیلی اعلان جریدۂ الاصلاح (بابت ۲۸ جون سنہ ۱۹۴۰ء) میں شائع ہوا ہے جس میں تمام واقعات پر تفصیلی تبصرہ کے بعد لکھا گیا ہے -

ان تاثرات اور بیان کے بعد چونکہ حکومت ہمارے اس اقدام کے معنی غلط سمجھی ہے اس لیے میں [illegible] برائے مصالحت خاکساروں کو حکم دیتا ہوں کہ

۱- جن صوبجات میں خاکسار تحریک خلاف قانون نہیں ہے - وہاں اپنا پر امن عمل جاری رکھیں اور قانون وقت کی پابندی کریں -

۲- خاکسار مساجد میں جمع نہ ہوں اور جو جمع ہو گئے ہیں وہ پر امن طریقے سے واپس ہو جائیں -

۳- ان صوبجات میں جہاں خاکسار تحریک خلاف قانون قرار دی گئی ہے - خاکسار اپنی وردی اور بیلچہ استعمال نہ کریں مگر اپنی پر امن تبلیغ جاری رکھیں اور علامہ محترم کی گرفتاری کے لیے برابر احتجاج کریں -

ان احکام کے بعد میں یقین کرتا ہوں کہ حکومت تنگ دلی اور غلط فہمی کو چھوڑ کر -

۱- اپنے احکام تحریک کو خلاف قانون کرنے کے واپس لے لیگی -

۲۔ گرفتار شدہ خاکساروں کو رہا کر دے گی۔

۳۔ سب سے مقدم یہ کہ علامہ محترم کو رہا کر دے گی اور اس طرح اس بات ہی کو ختم کر دے گی جو تمام بے چینی کا باعث ہے۔

خاکسارو! اس نقصان کی جو تمہیں خواہ مخواہ پہنچا ہے خدا احسن تلافی کرے۔

یہ اعلان کسی تبصرہ کا محتاج نہیں لیکن پوزیشن کے اتنا واضح ہو جانے کے بعد بھی حکومت کی طرف سے پابندیاں اٹھا لینے کا کوئی اشارہ نہیں ہوا۔ جس سے اس کے ارادے ظاہر ہیں ان حالات کے پیشِ نظر ہم خاکساروں کو وہی مشورہ دیں گے جو اس سے پیشتر دیتے چلے آئے ہیں۔ کہ تصادم سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے اب اسی قصہ کو بڑھانا درست نہ ہوگا۔ جیسا کہ ہم نے اس سے پیشتر بھی لکھا تھا۔ خاکساریت اصل روح کا نام ہے ظواہر و رسوم کا نہیں۔ اس لئے اگر ظواہر و رسوم پر پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ تو مجبوری ہے اسے برداشت کیجئے حکومت سے نہ الجھئے لیکن اپنے سینے میں اس شمع ایمان کو فروزاں رکھئے بیلچہ۔ وردی۔ نشانِ اخوت۔ نام۔ نظام سب مٹائے جا سکتے ہیں لیکن ایمان کی جو حرارت دل کی گہرائیوں سے ابھر کر رگ و پے میں برق آسا دوڑ جاتی ہے۔ اسے دنیا کی کوئی قوت نہیں مٹا سکتی۔ مٹنے والی چیزوں کے پیچھے نہ جائیے۔ باقی رہنے والے جوہر کی فکر کیجئے ۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر ۔ کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

خاکسار بھائیو۔ تم تو زندہ ہو۔ زندہ رہو گے۔ مٹ جائے گی یہ شوریدہ بخت قوم جسے زندہ کرنے کے لئے تم نے موت تک کی پرواہ نہ کی پھر اس نے تمہاری قدر نہ پہچانی۔ مولوی خوش ہو جائے گا کہ دنیا سے "کفار" کی جماعت مٹ گئی۔ تمہارا مخالف ہندی مسلمان اطمینان کی نیند سو جائے گا کہ اس کے میٹھے خوابوں میں خلل ڈالنے والا کوئی نہ رہا لیکن یہ اپنے آپ کو فریب دینے والے اپنی موت آپ مر جائیں گے اور تم زندہ رہو گے کہ تمہاری موت میں ہزاروں زندگیاں جھلک رہی ہیں واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷) (دنیا میں باقی وہی چیز رہے گی جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہو گی) تم خدمتِ خلق اور سرفرازیٔ اسلام کے مقدس جذبات کو اپنے نورانی سینوں میں پرورش کئے جاؤ اور ناساعدتِ حالات سے دل گرفتہ اور پریشان خاطر مت ہو جاؤ۔ اپنے نصب العین کی صداقت پر ایمان امیر کی اطاعت اور اللہ کی نصرت پر بھروسہ۔ یہ وہ محکم قلعے ہیں جو تمہیں ساری دنیا کی مخالفتوں کے ہجوم سے پناہ دیں گے

اور انجام کار کامیابی تمہارے ہی لیے ہوگی۔

حکومت کے اعلان میں دو ایک باتیں اور بھی غور طلب ہیں۔ سالِ گذشتہ جب خاکساروں کے خلاف پابندیاں عائد کی گئی ہیں تو حکومت پنجاب نے بتایا تھا کہ اس کے پاس علامہ مشرقی کی چٹھیاں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملک کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرتے ہیں لوگوں نے مطالبہ بھی کیا لیکن یہ چٹھیاں باہر نہ آئیں۔ اب حکومت ہند نے اپنے اعلان میں لکھا ہے کہ

> "علامہ مشرقی اپنی ان کوششوں سے باز نہیں آتے اور ان کوششوں میں انھیں کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے کہ وہ باہر کی دنیا سے خلافِ ضابطہ خط و کتابت کریں۔ چنانچہ بعض خطوط جن کے متعلق انہوں نے کوشش کی کہ چوری چھپے جیل سے باہر بھجوائے جائیں۔ حکومت کے قبضہ میں ہیں۔"

حکومت نے اس امر کی تصریح نہیں کی کہ "باہر کی دنیا" سے مراد "ممالک غیر" ہیں یا جیل کے باہر کی دنیا۔ اگر علامہ مشرقی ممالکِ غیر سے ساز باز کر رہے ہیں تو ان کے خلاف کھلے بندوں مقدمہ چلانا چاہیئے تاکہ وہ لوگ جو انھیں ایسا خیال نہیں کرتے کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ اور اگر وہ محض جیل خانہ کے قاعدہ کی خلاف ورزی کرکے اپنے احباب یا تحریک والوں سے خط و کتابت کرتے ہیں تو جیل کے قواعد کی رو سے انھیں سزا دینی چاہیئے ان کی اس خلاف ورزی کی سزا تمام خاکساروں کو کیوں دی جائے!

حکومت نے یہ بھی لکھا ہے کہ

> "حکومت خیال کرتی ہے اور انھیں یقین ہے کہ بہ حیثیت مجموعی مسلمان اس سے اتفاق کریں گے کہ چند خاص مساجد میں خاکساروں کا مجوزہ انداز سے سکونت پذیر ہونا۔ مذہبی عمارات کو غیر مذہبی امور کے لیے ناجائز استعمال کے مرادف ہوگا۔"

ہم سر دست اس اہم موضوع کو نہیں چھیڑنا چاہتے کہ مذہب کی رو سے مساجد کا صحیح استعمال کیا ہے اس لیے کہ اس طرح ہم زیر نظر مسئلہ سے بھی دور جا پڑیں گے اور ضمنی طور پر ایسے اہم مسئلہ کے متعلق بھی وضاحت سے کچھ عرض نہ کر سکیں گے اس وقت ہم صرف اتنا دریافت کریں گے کہ حکومت ان امور کا فیصلہ کس طرح کرتی ہے کہ فلاں معاملہ مذہبی ہے اور فلاں

غیرہ بھی۔ ظاہر ہے کہ حکومت کے نظام میں اسلامی شریعت کے قوانین کا تو کوئی شعبہ نہیں نہ ہی ان کے ہاں حضرات علماء کرام و مفتیانِ عظام کی کوئی جماعت ہے جو ان مسائل پر حکومت کو مشورہ دیں۔ ان چیزوں کی عدم موجودگی میں حکومت کس طرح فیصلہ کر سکتی ہے کہ فلاں جماعت کا فلاں عمل غیر شرعی ہے لیکن حکومت کو چھوڑیئے ہمیں تو مایوسی کی ہنسی آتی ہے خود مسلمانوں کے مذہبی جماعتوں پر۔ چونکہ ان کا خاکساروں سے اختلاف ہے۔ اس لئے اس پارٹی بازی نے ان میں اتنا سوچنے کی بھی صلاحیت نہیں رہنے دی۔ کہ حکومت کا یہ فیصلہ صرف خاکساروں کے متعلق نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے متعلق ہے۔ حکومت نے خاکساروں کے متعلق یہ کہدیا کہ ان کا اقدام خلافِ شریعت ہے۔ اور آپ سب خاموشی سے اسے دیکھتے رہے کل کو جب آپ میں سے کوئی جماعت ایسا اقدام کرنے لگے گی جو حکومت کی نگاہ میں غیر مذہبی ہوگا تو یہی فیصلہ آپ کے لئے بھی صادر ہو جائے گا کہ آپ مساجد کو اس غرض کے لئے استعمال نہیں کر سکتے اس وقت آپ کس منہ سے کہہ سکینگے کہ حکومت کے پاس اس امر کا کیا دلیل و سند ہے کہ یہ اقدام خلاف شریعت ہے اور اس کے لئے مساجد کو استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ علماء کی جماعت نے محض خاکساروں کے مخالفت کے جنون میں اپنے سکوت سے ایک ایسی نظیر قائم کرا دی ہو جو اس کے بعد ہر موقعہ پر ان کے سامنے آئے گی۔ اور انھیں اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ ان کی آج کی روش کس قدر ہلاکت آفریں عواقب کا موجب تھی۔ ستیاناس ہو اس گروہ بازی کا کہ اس سے آنکھوں پر تعصب کی ایسی پٹی بندھ جاتی ہے جو انسان کو خود ہلاکت کے گڑھے میں جا گراتی ہے۔

اشاعتِ سابقہ میں ہم نے لکھا تھا کہ معلوم ہوا ہے کہ جناب نظام نے فرمایا ہے کہ مذہب اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ریاست کے انصرام میں ان کے ذاتی مذہب کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ یہ اسلام کے خلاف ایک بہت بڑا اتہام تھا اور منسوب تھا ایک بہت بڑی ذمہ دار شخصیت کی طرف۔ اس لئے ہم نے بنا بر احتیاط یہ بھی لکھا تھا کہ ہمیں انتظار کرنا چاہیئے شاید یہ خبر غلط ہو اور اس کی تردید ہو جائے لیکن اس وقت تک ہماری نگاہ سے اس کی تردید نہیں گزری بنا بریں اس کے سوا چارہ نہیں کہ اسے صحیح تسلیم کیا جائے۔

اس دوران میں ہماری نگاہیں ہر مسندِ علم و افتاء اور ہر خانقاہ و زہد و ورع کی طرف بصد اشتیاق اٹھتی رہیں کہ کہیں سے اس اسلام سوز اعلان کے خلاف کوئی آواز بلند ہو لیکن یہ پر حسرت نگاہیں بہ ہزار حرمان و یاس بقیہ لمعات بر صفحہ

بہ سلسلۂ اصلاح

دو باتیں

(از جناب مولانا مشتاق احمد صاحب افغانؔ فاضل دیوبند و مولوی فاضل)

اقبال اور مسلمان ۔ قرآن اور مسلمان

اِس مضمون پر قلم اُٹھانے کو تیار ہوا کہ اقبال مرحوم کی مثنوی " پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق " کے صفحہ ۶۵ کے مندرجۂ ذیل اشعار میری نظر سے گذرے جو بحضور رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسلام عرض کئے گئے ہیں ؎

در عجم گردیدم و ہم در عرب — مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب
ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ — ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک چوں حریر — آرزو در سینۂ او زود میر
ایں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام — حریّت اندیشۂ او را حرام
مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود — از وجودش ایں قدر دانم کہ بود
ایں زخود بیگانہ ایں مستِ فرنگ — نانِ جو میخواہد از دستِ فرنگ
شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر — از مقامِ او نداد او را خبر
مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست — در دِلش لاغالب الا اللہ نیست
از فرنگی مے خرد لات و منات — مومن و اندیشۂ او سومنات
ما ہمہ افسونیٔ تہذیبِ غرب — کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب
تو ازاں قومے کہ جامِ او شکست — وانما یک بندۂ اللہ مست

تا مسلماں باز بیند خویش را
از جہانے برگزیند خویش را

ترجمانِ حقیقت اقبالؔ مرحوم فرماتے ہیں کہ :-

عجم ہو خواہ عرب۔ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اور حق پرست تو کمیاب اور نایاب ہیں۔ ال ابولہب اور اس کے پیروں کی کثرت اور ارزانی ہے۔ مسلمان کے آباو اجداد تو روشن دماغ تھے۔ مگر اس کا ظلمت آباد دل بے چراغ ہے۔ جوانی میں ریشم کی طرح نرم و نازک ہے اور اس کے سینہ میں جو آرزو ئیں اُٹھتی ہیں وہ بہت جلد مرجاتی ہیں۔ ان میں دوام اور پائیداری نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ کئی پشتوں سے غلامی اس کا جُز بدن ہوگئی ہے۔ آزادگی اس کے فکر میں بھی حرام ہے۔ مدرسہ کی تعلیم نے جہاں تک مجھ معلوم ہے اس سے دین کا جذبہ کھولیا ہے۔ اپنے آپ سے بیگانہ ہوکر فرنگ کی محبت میں مست ہوگیا ہے۔ اسے مذاق سمجھکر نانِ جویں بھی اس کے ہاتھ سے لیتا ہے۔ مدرسہ کا استاد، کالج کا پرنسپل اور مسجد کا مولوی کم سواد اور کم نظر ہے جس نے مسلمان کو اس کے مقام سے باخبر نہیں کیا۔ بلکہ اُلٹا اُسے بے خبر رکھا۔

بھلا مومن بھی کیا مومن ہے جو موت کی رمز سے آگاہ ہی نہیں۔ اس کے منہ پر تو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے مگر اس کا مفہوم لَا غَالِبَ اِلَّا اللّٰہ نہیں سمجھا۔ غیر اللہ کو غالب سمجھکر اس کے آگے جھک جاتا ہے اور فرنگی سے لات ومنات یعنی خُدا سے بے خبر رکھنے والی تعلیم خریدکرتا ہے۔ یہ بھی کوئی مومن ہے جس کا اندیشہ اور فکر سومنات ہے۔ مسلمان تہذیب مغرب کا دلدادہ ہے۔ جادو زدہ ہے اور بغیر حرب وضرب اس کا مقتول ہے۔

اس لئے فریاد ہے، کہ ایسی قوم سے جس کا جام ہی ٹوٹ گیا ہے، جس کا سررشتہ گم ہے اور جس کا شیرازہ منتشر ہوگیا ہے ایک بندہ ایسا ظاہر کردے جو اللہ مست ہو۔ غیر اللہ سے بے نیاز ہو۔ ماسوا کا ہو اور طاغوت کو ضربِ کلیمی سے پاش پاش کرنے والا ہو تاکہ مسلمان اس کی تعلیم سے اپنے آپ کو پھر دیکھ لے اور جہان سے اپنے آپ کو برگزیدہ اور منتخب بنالے۔

اقبالؔ مرحوم نے اپنے مصفا قلب کے اندر مسلمان کو دیکھ کر جن الفاظ میں ان کا نقشہ کھینچا ہے اُسکی طرف خود مسلمان کو بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہیے کہ کہنے والے نے کیا کہا ہے۔ مسلمان جس معراج سے اُترا وہ خودی ہے۔ اُسے عرصہ سے بھول چکا ہے۔ "خودی" کو تکبر سمجھتا ہے۔ "تواضع" کے خلاف قرار دیتا ہے "خودی" کی مذمت میں تکبر کی مذمت کو زبان پر لاتا ہے۔ غلامی نے تواضع کی جگہ لے لی ہے۔ "تواضع" جو

سے بڑی قوموں کو اپنا دست نگر رکھ سکتے تھے (اور رکھ رہے ہیں) اور یوں بڑی بڑی سلطنتوں پر عملاً انہی کی حکومت تھی۔ اگرچہ آشفتہ حالی کا اس پر بھی یہ عالم تھا (اور اب بھی ہے) کہ ایں سوماندہ وآں سود رماندہ۔ تمام عمر دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں کٹ گئی اور خدا کی اس وسیع و عریض زمین میں انہیں سر چھپانے کو چھت نہ مل سکی۔ بایں ہمہ بھوک اور افلاس کا عذاب تو نہ تھا جس قوم کے عذاب کا ہم ذکر رہے ہیں۔ وہاں تو دنیا بھر کی رسوائیوں اور تباہیوں کے ساتھ محتاجی اور مفلسی کی لعنت بھی مسلط ہے اس لئے ان کا عذاب فقید المثال اور ان کی مصائب بے نظیر ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو جتنی بلندی سے گرے اتنا ہی زیادہ چور چور ہو شکستگی و ریختگی بقدر اوج و رفعت ہوتی ہے۔

مسلمان کی سلطنت چھنی۔ دولت لوٹی۔ عزت مٹی۔ شیرازہ بکھرا۔ اجتماعیت گئی اور ان تمام مصیبتوں کی بڑی مصیبت اور تمام نقصانات سے اہم نقصان یہ کہ ان سے قرآن بھی چھوٹا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے تمام اعمال رائگاں اور ہر کوشش بیکار جا رہی ہے۔ مسلمانان ہند کی سو پچاس سال ادھر کی زندگی پر نگاہ ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ سینکڑوں تحریکات درد کی طرح اٹھیں اور آنسوؤں کی طرح بیٹھ گئیں۔ ہزاروں کوششیں صد بہار در آغوش ابھریں۔ اور برگ خزاں دیدہ کی طرح مرجھا کر مٹ گئیں۔ ہر قدم انہیں منزل سے دور لے جاتا گیا ہر جنبش ساحل سے پرے ہٹاتی گئی۔ ان کا عذاب بڑھتا گیا۔ ان کی غلامی کی زنجیریں اور زیادہ مضبوط ہوتی گئیں۔ مخالفت کی ہر قوت ان کی بربادی کے لئے ہجوم کر کے بڑھتی رہی اور خود انہی کے ہاتھوں سے انہیں تباہ کراتی رہی۔ توبہ۔ توبہ۔ غضب اور ایسا اندوہ ناک غضب۔ گرفت اور ایسی سخت گرفت

ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

ہم کس کس طرح کہئے اور کس کس انداز سے سنئے یہ حدیث الم دراز اور افسانۂ غم طویل ہے۔ اسی بکھرے ہوئے قافلے اور لٹے ہوئے کاروان کی آخری یادگار خاکساروں کی جماعت تھی جن سے کچھ کچھ امیدیں وابستہ ہو رہی تھیں بالآخر وہ بھی باقی نہ رہی۔

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا

یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے لاہور کے المناک واقعہ کے بعد۔ خاکساروں کو ہمیشہ یہی تاکید کی ہے کہ وہ قانون شکنی

اپنی جگہ بہترین خصلت ہے "غلامی" کی صورت اختیار کرچکی ہے۔ جس طرح خودی اور تکبر کی حدیں آپس میں مل جل گئی ہیں ٹھیک اسی طرح تواضع اور غلامی آپس میں مخلوط ہوگئی ہیں۔

ان حالات میں مسلمان کا نصب العین کیا ہوسکتا ہے؟ غلامی کے خوگر کو غلامی تواضع نظر آتی ہے۔ لعنت اور رحمت میں فرق نہیں سمجھتا۔ خودی کو تکبر گردان کر اس سے نفور ہے۔ اس لئے جس قعرِ مذلت میں گرا ہوا ہے بس اسے اپنا مقصودِ زندگی قرار دیتا ہے۔ لہٰذا اگر ایک "ٹوٹی ہوئی مینا" مسلمان سے یہ درخواست کرتی ہے کہ "اپنی خودی پہچان" اور "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" اپنے نفس کی معرفت میں رب کی معرفت ہے تو مسلمان ادھر دھیان ہی نہیں دیتا۔ اور عیسائیت اور ہندومت کی دیکھا دیکھی نفس کشی بطور ورد و وظائف، چلہ کشی اور گوشہ نشینی کو مذہب قرار دے کر دنیا پر لات مارتا ہے۔ دنیا کو مردار سمجھتا ہے، دنیاوی عیش و آرام کو، تخت و حکومت کو کافروں کا حق خیال کرتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم اس کو رہبانیت کہہ کر خود ساختہ بدعت قرار دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بیزاری کا اظہار کرتا ہے کہ قوم نے اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے لکھا اور فرض نہیں کیا گیا۔ (وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ)

تمام انبیاء علیہم السلام صرف انسانیت جو خلافتِ الٰہی کی مرادف ہے کی تعلیم دیتے آئے ہیں۔ ہر ایک پیغمبر نے انسانیت کے کسی ایک شعبہ کو لے کر دنیا کو راہنمائی کی اور سب کے آخر سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل انسانیت کی تعلیم دی۔

غرض انسانیت کی حفاظت اور نگرانی کے لئے پیغمبر علیہ السلام کی بعثت کو قائم کیا گیا ہے۔ اور انسانیت کیا ہے پہلا سبق خودی کی حفاظت ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے شرک سے بیزاری ہے۔ غیر اللہ سے دست برداری ہے۔ بت پرستی سے نفرت دلائی گئی ہے اور ماسوائے برات کا اعلان کرایا گیا ہے۔ اسی خودی کی حفاظت میں توحید اور ایک خدا کی یکتائیت اور اس کے لگاؤ سے وحدتِ امت پر زور دیا گیا ہے۔ جہاں خدا ایک ہوگا، وہاں انسان ایک ہوگا۔ کوئی انسان، انسان یا غیر انسان کو خدا کا شریک بنا کر اپنی خودی کو اس کے آگے ذلیل کر کے خود کو بیخود نہیں کرسکتا۔ ہاں خدا تعالیٰ کے آگے اس کے دربار میں جھک جانا اور بے خود ہوجانا خودی میں قطعاً حارج نہیں ہے۔ نماز پنجگانہ با ہمہ رکوع و سجود خودی شکن نہیں ہے۔ روزہ باہمہ فاقہ

خودی کے مخالف نہیں ہے۔ زکوٰۃ یعنی مال کا جبری اور معین ٹیکس خودی کو مانع نہیں ہے مسلمانوں کا سالانہ اجتماع یعنی حج مسلمان کی خودی میں حائل نہیں ہے۔ کیونکہ خودی کی حفاظت سے مقصود انسان کی انسانیت کا قیام ہے اور انسانیت خلافتِ الٰہی کے مرادف ہے۔ خلیفہ کا خدا کے دربار میں سربسجود ہونا یا قربانیاں کرنا خلافت کے قیام کا آئینہ دار ہے نہ کہ اس کا مخالف۔ اور یہی مفہوم خودی ہے۔

لیکن مسلمان ان مقاصدِ عالیہ کو الفاظ کے پیکروں میں کھو کر "روحِ خودی" سے یکسر بیزاری کا اظہار کر دیتا ہے اور یوں انسانیت کے اعلیٰ مقام سے گر کر قعرِ مذلت میں اس طرح جا پڑتا ہے کہ اپنے آپ کو بھی نہیں سنبھال سکتا اور زمین پر خود ایک بوجھ بن جاتا ہے جس کو سنبھالنے کے لئے دوسروں کو تعینات کر دیا جاتا ہے۔ خلافتِ الٰہی کا حامل "کالانعام بل ھم اضل" کا مصداق ہو کر دنیا سے نسیاً منسیاً کر دیا جاتا ہے۔ سپین اس کو چھین لیا جاتا ہے۔ دمشق سے اسے نکال دیا جاتا ہے۔ یہانتک کہ اس کی ہڈیاں بھی قبروں سے نکال نکال کر جلا دی جاتی ہیں۔ بغداد میں ہلاکو خاں آکر "خلیفۃ المسلمین" کو بوریوں میں بند کرا کے گھوڑوں کے اصطبل میں ڈال کر مٹی میں ملا دیتا ہے۔ انسانی خون اور کتب خانہ کی خاکستر سے دریائے دجلہ ایک ہی دن سرخ اور سیاہ دو رنگ بدلتا ہے ارضِ دہلی (ہندوستان جنت نشان کے دل) کو انسانی خون سے رنگین کر کے خودی سے غافل اور بے خودی کے حامل مسلمان کو ہمیشہ کے لئے بے خود کر دیا جاتا ہے۔ اس کا نام انسانوں کی فہرست سے نکال دیا جاتا ہے۔ ابدی غلامی اس کے ماتھے پر داغ دی جاتی ہے۔

اور یہ سب مصیبت اسی لئے آئی کہ مسلمان کو یہ یاد نہ رہا کہ کس کے سامنے اپنی خودی کو چٹان کی طرح محکم و استوار رکھنا ہے اور کس مقام پر اسے "بیخودی" میں تبدیل کر دینا ہے۔ وہ بھول گیا کہ جھکنا کس کے سامنے ہے اور قیام کا کون سا مقام ہے جھکنا ضرور ہے مگر کس کے سامنے؟ خدا کے سامنے! جو تمام انسانوں کو اپنی حکومت کا سبق دے کر یہی سکھاتا ہے کہ خدا کے مقابلے میں تو انسان کچھ نہیں ہے مگر خدا کے منکر، انسانیت کے مخالف، حقوق العباد کے دشمن اور زمین میں فساد پھیلانے والوں کے سامنے انسان خلافتِ الٰہیہ کا حامل ہو کر اپنی خودی کا اعلان کرتا ہے اور ان کی خود پسندی کا جو خلافتِ الٰہیہ کی مخالف ہو کر ان کے ذاتی وقار کی حامل ہے، مقابلہ کر کے الٰہی وقار قائم کرنے کے لئے ان کو مٹی میں ملا دیا جاتا ہے۔ (ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ) اور

بڑی بڑی طاقتوں، فراعنہ اور نمارده کو تُرقاب ارزندِ بادو باراں کر دیا جاتا ہے۔ غرض وقارِ الٰہی کے مقابل، انسانی وقار ہیچ ہے۔ یعنی خدا پرستی کے مقابل انسان پرستی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ جہاں انسان خدا کا مدِ مقابل بن کر کھڑا ہو جائے اُسے سطحِ زمین سے محو کر دینا عین انسانیت ہے۔ یہی خودی ہے۔ اظہار خلافتِ الٰہیہ ہے۔ ایسی سرکشی و طغیان کے مٹانے کے لئے خود مٹ جانا، قتل ہو جانا، آگ میں جل جانا، خودی ہے۔ عین حیات ہے۔ صحیح زندگی ہے "لاتقولوا لمن یُقتَلُ فِی سَبِیْلِ اللہِ اَمْوات۔ بَلْ اَحْیَاءٌ۔ جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جائیں ان کو مُردہ مت کہو بلکہ صحیح زندہ اور زندگی کے قائل اور حامل تو وہی تھے اور ہیں "ولکن لاتشعرون" لیکن تم کو شعور نہیں ہے۔ تمہاری سمجھ یہاں کام نہیں کرتی۔ اغراض اور شہوات کی زندگی جینے کو جینا سمجھنا درحقیقت زندگی اور حیات کی توہین ہے۔ زندگی کے مفہوم سے بے خبری ہے۔

مسلمان تو اتنا بے خود ہو گیا ہے کہ اپنے سے بھی بے خبر ہے۔ بیوی بچوں سے بھی بے خبر ہے۔ مال و دولت سے بھی بے خبر ہے۔ ملک و سلطنت کو شجرۂ ممنوعہ قرار دیتا ہے۔ تمام دُنیا کو مُردار سمجھتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک دفعہ جمعہ کے روز ایک واعظ صاحب سے یہ کہتے سُنا کہ "ولایت" کے لئے چار شرطیں ہیں۔ جہاں پائی جائیں بس وہ ولی ہے :-

۱۔ قلت الکلام = کم بولنا

۲۔ قلت الطعام = کم کھانا

۳۔ قلت المنام = کم سونا

۴۔ قلت الاختلاط مع الانام : لوگوں سے کم برتنا یا کم میل جول رکھنا

وعظ کے اختتام پر میں نے اٹھ کر کہا کہ واعظ صاحب اگر ولایت کی یہی چار شرطیں ہیں تو آپ پر یہی چار آج آزمائی جاتی ہیں۔ جس سے آپ واعظ سے ولی بن جائیں گے۔ موسم تھا سردی کا۔ میں نے کہا آج آپ کو ایک حجرہ میں بند کرکے باہر سے تالا لگا دیا جاتا ہے۔ آپ کو آج کھانا نہیں ملیگا۔ قلت الطعام کی ایک شرط پوری ہو جائے گی۔ جب آپ کو کھانا نہیں ملیگا تمام رات آپ کو نیند نہیں پڑیگی "قلت المنام" کی دوسری شرط پوری ہو جائے گی۔ آپ کے ساتھ کوئی کلام نہیں کریگا۔ تو "قلت الکلام" کی تیسری شرط کی تکمیل ہو جائے گی۔ تالا لگا دینے سے آپ کو قلت الاختلاط مع الانام کی چوتھی شرط مُفت میں ہاتھ آجائے گی۔ ویسے بھی اکثریت مسلمانوں کی ایسی ہے جن کو پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا

کھانا کم ملنے سے نیند بھی نہیں آتی۔ جب کھانے کو کچھ نہ ملے تو آدمی کی زبان بات کرے کہ کب تیار ہوگی قلت الطعام مع الانام کی یہ حالت ہو کر ہندو بھائی مسلمان کو اچھوت اور ملیچھ قرار دیتا ہے۔ عیسائی کا تو محکوم ہے۔ حاکم کا ہم پلہ کب قرار دیا جا سکتا ہے؟"

میرا یہ کہنا تھا کہ حاضرین کی آنکھیں کھل گئیں مگر واعظ صاحب دم بخود تھے کہ ان کا منتر بیکار ہو گیا۔

انہی خیالات کا اثر ہے کہ زندگی سے بیزاری کو ولایت قرار دے کر 'موتوا قبل ان تموتوا' جیسے پُر شد نعرے (جو نہ قرآن کریم میں ہیں نہ حدیث صحیح میں) ورد زبان ہو گئے ہیں۔ اور زندگی میں موت کو اپنے اوپر وارد کر کے بیز اور بزدل کی طرح وقت گذارا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں ست قوم پر دوسری قوموں نے باز کی طرح جھپٹا مار کر ان سے مال سلب کر لیا۔ اور حکومت چھین لی۔

وہی مسلمان کہتا ہے کہ اس کی زندگی کا مقصود یہ ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر اللہ ہو اللہ ہو کیا جائے۔ مسجدوں میں اس قدر آرام مہیا ہو کہ پیشاب خانہ مسجد کے اندر ہو۔ استنجا خانہ مسجد کے اندر ہو۔ وضو خانہ ہو۔ پنکھا ہو۔ فرش پختہ ہوں۔ گلکاری اور مینا کاری ہو وغیرہ وغیرہ۔ اور مسجد سے باہر کی دنیا میں کوئی قتل ہو جائے، خون خرابہ ہو جائے، لٹ جائے، تباہ ہو جائے۔ برباد ہو جائے۔ ملکوں کے ملک الٹ جائیں۔ سلطنتوں کی سلطنتیں اوپر تلے ہو جائیں۔ مسجد کے مسلمان کو اس سے واسطہ نہیں ہے — افسوس! وہی مسجد بھی تو اب آزاد نہیں رہی۔ مسلمان کو وہاں بھی خدا کی یاد آزادی کی نصیب نہیں۔

اس کی زندگی کا یہ مقصود ہے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر یاد اللہ میں مست ہو جائے۔ گویا انسان، انسانیت کو چھوڑ کر، تمام انسانی تعلقات پر لات مار کر، حقوقِ انسانیہ سے چشم پوشی کر کے اور خلافتِ الٰہیہ سے دست بردار ہو کر "نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ" کے منصب پر پہنچنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس کے برعکس خلافت تو "عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" کا نام ہے۔

مسلمان کا خدا ربّ العٰلمین ہے۔ اس کا رسول رحمۃ للعٰلمین ہے۔ اس کی کتاب (قرآن کریم) ذکر للعٰلمین ہے۔ اس کا نصب العین اسلام ہے۔ تمام دنیا کو سلامتی میں رکھنا۔ یہودی، نصرانی، مجوسی، بدھ اور زرتشتیوں کی سلامتی اور حفاظت۔ سارے جہان کا درد اس کے دل میں ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ فرشتہ نہیں کہ

جس کا نہ باپ ہو نہ بھائی۔ ماں ہو نہ بہن۔ بیٹا ہو نہ بیٹی۔ قریبی ہوں نہ ہمسایہ۔ دوست ہو نہ دشمن اور صرف اپنے وجود کا ذمہ دار ہو۔ انفرادیت کا شکار ہو۔ وہ تو اجتماعی زندگی بسر کرنے آیا ہے۔ ماں باپ کی خدمت کرنا اس کا فرض ہے۔ بیٹا بیٹی کی حفاظت اس کا ذمہ ہے۔ ہمسایہ اور قریبی کی نگرانی اس کی ڈیوٹی ہے۔ غرض وہ خدا کا سپاہی ہے خدا کا خلیفہ ہے اور اس کا نائب

مسلمان صرف مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے ہی نہیں آیا۔ پہلے بھی انسانوں میں "قسیسین و رُھبانا" موجود تھے۔ مسلمان صرف مومن نام رکھوانے کے لئے نہیں آیا "منہم المومنون" اس سے پہلے موجود تھے۔ اں مسلمان عمل زندگی بسر کرنے کے لئے آیا ہے۔ خود صالح یعنی عمل صالح کرنے کے لئے آیا ہے۔ "مصلح" دوسروں کی صلاحیت کا ذمہ دار ہے۔ صلاحیت، صلاح، اور عمل صالح کیا چیزیں ہیں؟ مسلمان اس کو بہت محدود کر دیتا ہے یعنی عمل نیک کرنے والا (صالح۔ نیک) اس میں شک نہیں کہ مسلمان اصطلاحی نیک کام کرنے والا بھی ہے بلکن مشکل یہ ہے کہ اس نے نیکی کو چند عبادات کی ظاہری شکل میں محدود کر رکھا ہے حالانکہ صالح کے معنی صلاحیت والے اعمال رکھنے والا انسان" مراد ہیں۔ یعنی جس انسان کے کام صلاحیت والے ہوں۔ جن میں صلاحیت پائی جائے کہ وہ خلافت الٰہی اور حکومتِ ربانی کی نیابت کا اہل ہو۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے کہ "وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ" ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں ذکر کے بعد کہ "الارض کے وارث ہوتے ہیں میرے صالح بندے" یعنی وراثتِ ارضی اس کے سپرد کر دی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے بندوں سے صالح ہوں۔ صالح بندوں کو ارضی وراثت عطا کئے جانے کا اعلانِ الٰہی کیا مسلمانوں کی آنکھیں نہیں کھولتا۔ چالیس کروڑ مسلمان دنیا میں بستے ہیں۔ چند لاکھ انسانی بستیوں کو چھوڑ کر کروڑوں مسلم آبادی بھیڑ بکری اور گھاس پھونس کی زندگی بسر کر رہی ہے

ہندوستان (ولیوں، پیروں اور روحانی لوگوں کی زمین) کا مسلمان کروڑوں کی تعداد میں حکومت الٰہیہ کے قیام کا کہاں تک ذمہ دار ہے! خود غیروں کی حکومت میں زندگی کے سانس پورے کر رہا ہے۔ لاکھوں مسلمان یورپ میں عیسائیوں کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ روسی حکومت۔ چین اور ڈچ انڈیز کے کروڑوں مسلمانوں کو دیکھئے کہ کس طرح دن گذار رہے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں ہندوستان کے ہزاروں مسلمان (مسجد کے امام شامل کرکے)

یہ بھی نہ جانتے ہونگے کہ ان ملکوں میں مسلمان بستے بھی ہیں یا نہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستانی لباس سے ایک انچ ادھر اُدھر ہو جانے والا مسلمان ہی نہیں رہتا۔ افریقہ تمام مسلمانوں کی آبادی اور اُن کی اکثریت پر مشتمل ہے مگر حکومت سوائے مصر کی نیم آزاد سلطنت کے کہیں بھی مسلمان کی نہیں ہے۔ ہر جگہ غیر مسلم حکمران ہے۔ یورپین سلطنتوں نے افریقہ کی نوآبادیات کو آپس میں حصّے بخرے کر لیا ہوا ہے۔ بھلا مسلمان کی دنیا میں ضرورت اسی لئے ہے کہ وہ دوسری قوموں کا محکوم اور اُن کے سامنے بیہودگی کا پورا مظہر ہو؟

خلافتِ الٰہی کے ذمہ دار۔ حکومتِ ربّانی کے نگران کی اندرونی زندگی یعنی مسلمان کا مسلمان سے سلوک۔ ملاحظہ کیا جائے تو شرم آتی ہے۔ ایسے لوگوں کو خلافتِ الٰہیہ سپرد کی جائے؟ اللہ میاں منصف ہے۔ عادل ہے۔ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ رحیم ہے۔ اس نے ہزاروں سال کی حکومت دے کر دیکھ لیا ہے کہ مسلمان (خصوصاً ہندی مسلمان) ناکارہ ہوگیا ہے۔ 'خودی' کو ارزاں بیچ بیٹھا ہے بلکہ کھو چکا ہے۔ دوبارہ اُسے بغیر احساسِ زیاں کیوں کر حکومتِ الٰہیہ سپرد کی جائے۔ جب مسلمان کا دن اس کی رات سے زیادہ سیاہ ہوگیا ہے۔ جب مسلمان کا قول اس کے عمل کے خلاف ہے۔ جب مسلمان کی زبان اس کے دل کی نافرمان ہے۔ جب مسلمان کا بیرون اس کے اندرون سے موافقت نہیں کھاتا۔ جب ظاہری عقیدت پہ مذہب کی بنیاد رکھ کر عمل سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ جب اس کا قلب اس کے جسم پر حکمران نہیں ہے۔ جب گناہگار اور نافرمان مسلمان ہے تو اللہ کا مقت اور مقت بھی کبیر اس قوم پر آگیا۔ اور اُسے حکومت کے تخت سے اُتار کر نیچے پٹکا گیا۔ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاس۔ اس کے باوجود کیا مسلمان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ کس مقام سے گرا ہے؟ اگر اُسے احساس ہے تو غنیمت ہے۔ کیونکہ سب سے بڑی چیز تو ہے احساس۔ جس قوم کا زیاں کے ساتھ احساس بھی مفقود ہو جائے اس کا راہِ راست پر آنا یا لانا بہت مشکل ہے۔ مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ مسلمان جب گرا تو اس نے سمجھا کہ اس کی تقدیر میں لکھا تھا گرنا۔ گویا اُبھرنا بھی تقدیر تھا تو گرنا بھی تقدیر ہی۔ اگر اب مسلمان سنبھلنے کا نام لیتا ہے تو تقدیر کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور تقدیر کا مقابلہ کرنا بڑا گناہ ہے۔ بھلا تقدیر بھی ٹل سکتی ہے۔ اور ایسا اگر ہو اب جس قدر غلطیوں کا مرتکب ہو رہا ہے اس کے ارتکاب کا ذمہ دار اپنے آپ کو نہیں سمجھتا۔ کہتا ہے جو کچھ کیا جا رہا ہے تقدیر ہے۔ اور اپنی سستی۔ کاہلی اور غفلت کا نام توکل ہے۔ ذلت اور غلامی کا نام تواضع۔ اسلامی اصطلاحیں بھی ذہنیت کے گندہ ہو جانے سے بدل گئی ہیں۔ پھر آؤ ایک نئی دنیا بسائیں (یعنی وہی پرانی دنیا) مسلمان کو

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کے عہد کی طرف لے جایا جائے۔ تب کہیں جا کر اسے مسلمان کی زندگی کا نصب العین سمجھایا جا سکتا ہے۔

میں چاہتا ہوں ذرا تھم کے انھیں اسلام کے ارکانِ خمسہ (کلمۂ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج) پر ایک مختصر سا تبصرہ کرتا جاؤں ——

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ | چار الفاظ کا مرکب ہے اور اس مرکب میں لفظ (ا) صرف ایک ہی نہیں۔ بلکہ حرف الف۔ لَ۔ اور ہٗ (الہٰ) کے تین حرفوں کے ہیر پھیر سے یہ مرکب بنا ہے۔ کیا اس مرکب کا ورد کرنا اور کرانا ہی مسلمانوں کا نصب العین ہے! غالباً یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ سیدنا محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام مذاہب کے پیرو لا الٰہ الا اللہ کا زبان سے ورد کرتے تھے۔ تمام مذاہب کا اصل الاصول یہی کلمہ تھا۔ پھر آخری نبیؐ کے اس کلمہ پر زور دینے سے کیا مطلب ہے؟ بات یہ ہے کہ کلمۂ توحید کا مفہوم یہ ہے کہ لَا (نہیں) اِلٰہَ (کوئی غالب) اِلَّا (مگر) اللّٰہ (اللہ تعالیٰ) یعنی خدا تعالیٰ ہی غالب ہے۔ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی غالب نہیں ہے انسان ہو یا غیر انسان۔ نبی ہو خواہ ولی۔ فرشتہ ہو خواہ جن۔ معمولی حاکم ہو یا ایک عظیم الشان بادشاہ۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہ نہیں حکم مگر اللہ تعالیٰ کا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا حکم نہ ماننا چاہئے۔ انسان، انسان پر حاکم نہیں ہے۔ ہاں خدا تعالیٰ کی حکومت پر عمل کرانے کے لئے انسان مامور ہے۔ پیغمبر خدا تعالیٰ کی حکومت کو دنیا میں منوانے کے لئے آتے ہیں

غرض اس کلمہ سے جس کا مفہوم اوپر گذر چکا ہے تمام مذاہب روکش ہو گئے تھے۔ اغراض اور شہوات کے پرستار تھے۔ انسان دوسرے انسانوں پر حکومت کرتا تھا۔ انسان، انسانوں پر ظلم کرنا روا رکھتا تھا۔ انسان، انسان فروشی علی الاعلان کرتا تھا۔ انسان، انسان کو دن دہاڑے لوٹ لیتا تھا۔ انسان، انسان سے بالجبر سجدہ کراتا تھا۔ انسان، زندہ اور مردہ انسان کے آگے جھک جانے پر مجبور تھا۔ انسان بے جان پتھروں اور مورتیوں (جن کو انھوں سے گھڑ کر رکھا تھا) کے آگے اپنی اغراض پیش کرتا۔ ایک انسان دوسرے انسان کے خلاف پتھروں اور جھوٹے معبودوں سے بارگاہِ الٰہی میں سفارشیں طلب کرتا۔ غرض غیر اللہ اور ماسوا کا حکم دنیا پر چل رہا تھا۔ دنیا میں تفریق تھی۔ انتشار تھا۔ تشتت تھا۔ مخالفت تھی۔ عداوت تھی۔ دشمنی تھی۔ (کُنْتُمْ اَعْدَآءً) دنیا دوزخ کے گڑھے پر کھڑی تھی (کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ) کہ سنانے والے نے سنایا۔ کہنے والے نے کہا۔ کرنے والے نے

چند معروضات پیش کرتا ہے۔ اُسے کہتا ہے "ایاک نعبد" ہم صرف تیرے ہی ملازم اور غلام ہیں۔ میں نہیں کہتا۔ "ہم" کہتا ہے۔ اپنے ساتھ۔ اگر اکیلا پڑھ رہا ہے۔ جماعت المسلمین کو بھی لئے ہوئے ہے۔ درخواست میں اُن کو بھی شامل کرتا ہے۔ کیونکہ مسلم انفرادی زندگی سے بیزار ہے۔ وہ اپنی زندگی میں دوسروں کی سلامتی کا درد لئے ہوئے ہے تو 'مسلم' ہے۔ اگر صرف اپنی فکر میں رہتا ہے تو مسلم نہیں ہے۔ 'سالم' ضرور ہے۔ اور سالم کی نجات اسلامی نقطۂ نگاہ سے بہت دور ہے۔ اسلام کہتا ہے 'علیکم بالجماعة' اپنے اوپر جماعت کو لازم رکھو۔ اس لئے نماز میں اللہ تعالیٰ سے "ہم تیرے ہی غلام ہیں" کہہ کر یہ بھی واضح کرتا ہے کہ تیرے در کے سوا کسی کے غلام نہیں اور تیری ہی اعانت چاہتے ہیں۔ ایاک نستعین۔ تیرے سوا کسی اور کی اعانت ہمیں مطلوب نہیں۔ اھدنا الصراط المستقیم۔ ہمیں سیدھی راہ دکھا اور چلا۔ صراط الذین انعمت علیھم۔ اور وہ راہ منعم علیہم کی راہ ہے۔ انعام کئے گئے لوگوں کی سڑک ہے۔ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ۝ جو مغضوب علیہم اور ضالین نہ تھے۔

نماز میں الصراط المستقیم کی وسعت مسلمانوں کی آرزوؤں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے اللہ تعالیٰ کے دربار میں پہنچ جاتی ہے۔ وہاں سے مقبولیت حاصل کر کے مسلمانوں کی زندگی کا جزو بن جاتی ہے۔ اب دنیا کی کونسی نعمت ہے جو مسلمان کے حصے میں نہیں آتی اور سب سے بڑی نعمت نبوت اور حکومت ہے۔ نبوت تو سب کے حصے میں نہیں آتی بلکہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نعمتِ نبوت ختم ہوگئی ہے البتہ حکومت کا ہر ایک خواہشمند اور مستحق ہو سکتا ہے۔ نماز با جماعت میں وحدتِ اُمت کا سبق ہے تو اطاعتِ امیر بھی اس کے اندر مضمر ہے۔ ایک امام کے اشارے سے۔ ایک امام کے حکم سے تمام جماعت رکوع میں ہے تو اسی وقت قیام کر کے سجدہ میں چلی جاتی ہے۔ غرض تمام جماعت کی باگ ایک ہی امام کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور یہی روح ہے نماز کی۔ جس سے مسلمان کو امارت اور اطاعت دونوں سبق بیک وقت دیئے جانے مطلوب ہیں۔ کیونکہ 'مسلمان' ہی سے دنیا کی امامت کا کام لیا جانا مطلوب ہے۔ (واجعلنا للمتقین اماما) گویا نماز خلافتِ الٰہیہ کے قیام کی ایک چھوٹی سی صورت ہے اور نماز سے یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ خدا کی توحید میں قوم کی 'وحدت' کا راز مضمر ہے۔ اور یہی وحدت اصل خودی ہے۔ جو خلافتِ الٰہیہ کے پیغام کی ایک چھوٹی سی

صورت ہے۔

روزہ تیس دن کی بھوک سے خدا تعالیٰ کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ اگرچہ روزہ کی ظاہری صورت یہی ہے کہ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک ایک مقررہ وقت کے لئے مسلمان سے کہا گیا ہے کہ وہ فاقہ سے رہے۔ پانی نہ پئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس سے اصل مقصد یہی ہے کہ مسلمان فاقہ آشنا ہو کر فاقہ کش لوگوں سے آشنا ہو جائے اور خلافتِ الٰہی کے قیام کے لئے اگر اُسے فاقوں پہ فاقے کرنے پڑیں تو اس کے پاؤں میں کوئی لغزش نہ آئے۔ اور روزہ میں ایک طرح سے وحدتِ مدنی کا سبق بھی موجود ہے۔ یعنی اگر تمام لوگ ایک جیسا کھانا نہیں کھا سکتے تو ایک وقت سب لوگ بھوکے تو رہ سکتے ہیں۔ عملی مساوات کا اس سے بہتر سبق کہاں اور کس طرح مل سکتا ہے؟ غریب پروری اور غرباء سے ہمدردی کی اس سے بہتر تمثیل کیا ہو سکتی ہے؟ مختلف مواسم اور قمری مہینوں میں روزے کے مقرر کرنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی موسم جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری میں مانع نہ ہو۔

زکوٰۃ جمع شدہ مال پر جس پر سال گذر جائے' چالیسواں حصہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو قوم کی حمایت اور خلقِ خدا کی بہتری کی راہ ہے نکال کر خرچ کیا جائے۔ تاکہ مال صرف اغنیاء میں ہی نہ پھرتا رہے بلکہ غرباء اور ضرورتمندوں میں آکر ایک طرح سے اشتراک اور اشتمال بھی ہو جائے کَیْلَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ' ـــ یہ بھی خلافتِ الٰہیہ اور اصلی خودی کے قیام کا ایک اہم مرکز ہے۔

حج دُنیا بھر کے مُسلمانوں کی ایک کانفرنس سال میں ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں بُلائی جاتی ہے۔ اس سے مقصد تمام دنیا کے مُسلمانوں میں وحدت کے قیام کے علاوہ تمام دُنیا میں خلافتِ الٰہیہ کا قیام بھی ہے۔ ارکان حج کی ادائیگی۔ اس کی ظاہری صورت ہے۔ اگر اجتماع کی حقیقی روحِ حج سے گُم ہو جائے تو حج ایک جسدِ بے رُوح رہ جائے۔ گویا حج مُسلمانوں کی داخلی وحدت اور خارجی معاملات کی درستی کی ایک بہترین مؤتمر ہے۔

مضمون کی طوالت سے بچنے کے لئے میں نے نماز، روزہ وغیرہ ارکان اسلام پر مفصّل لکھنے سے گریز کیا ہے۔ الغرض ارکانِ خمسہ اسلامی خلافت الٰہیہ کے قیام، اندرونی وحدت، حقیقی اجتماع، اصلی خودی اور قومی وحدت کے بہترین مظاہر ہیں۔

مُسلمان بروئے قرآن

:- (۱) ایسا ہی ہم نے بنا دیا تم کو اُمّتِ وسطٰ تاکہ تم ہو جاؤ لوگوں پر نگران (ان کے اعمال پر رقیب، شاہد اور نمونہ) اور ہو رسولؐ تم پر نگران (تمہارے اعمال کے رقیب، شاہد اور نمونہ) (بقرہ)

معلوم ہوا کہ مسلمان افراط اور تفریط دونوں سے محفوظ رہ کر تمام دنیا کے مقابل اُمّتِ وسطٰ کا درجہ رکھتا ہے۔ جس کے دنیا میں آنے کی غرض و غایت یہی ہے کہ وہ تمام لوگوں پر نگران مقرر کیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ کا سپاہی ہے۔ خلیفۃ اللہ اور نائب ہے اور مسلمان چونکہ خدا تعالیٰ کی آخری کتاب کا وارث ہے اس لئے جس طرح رسول امت پر نگران ہے بعینہٖ اسی طرح مسلمان تمام اُمّتوں پر نگران ہے۔

مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ تمام اُمتوں کا جائزہ لے کر ان کی پوری نگرانی کرے۔ اپنے آپ کو ان کے اعمال کے لئے شاہد اور نمونہ بنائے۔ گویا مسلمان نہ صرف اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے بلکہ تمام دنیا کی ذمہ داری اس کی گردن پر ہے جس طرح اپنے لئے مسئول نہیں دوسروں کے لئے بھی مسئول ہے۔

(۲) اسی نے تمہارے ہی لئے زمین کو فرش بنایا (بقرہ) تمہارے ہی لئے زمین کو مہد بنایا (طٰہٰ) قرار بنایا (مومن) ذلول اور تابع بنایا (مُلک) بساط بنایا (نوحؑ)

معلوم ہوا کہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے بنایا ہے کہ مسلمان اُسے بطور فراش، مہد، قرار، ذلول اور بساط استعمال کریں اور کرائیں۔ یقیناً زمین فراش، مہد، ذلول اور بساط اسی صورت میں ہوگی جب اس میں فساد، قتل، خونریزی وغیرہ نہ ہوگی۔ اس کے بجائے سلامتی، امن اور آرام ہوگا۔ ہر جگہ فارغ البالی ہی فارغ البالی نظر آئے گی۔ اور اس کا ذمہ دار صرف مسلم ہے۔ سو مسلمان کا فرض ہے کہ زمین کو جہنم بنانے کی بجائے جنت بنا لے۔ دنیا کے امن اور سلامتی کا گہوارہ بنائے۔ کیا مسلمان اپنا فرض پورا کر رہا ہے؟ اور زمین کے کسی ٹکڑے پر متصرف ہے؟ فتبینوا و تدبروا۔

(۳) اس نے تمہارے لئے زمین میں راستے بنائے (زخرف) مسلمان کا زمین کے کتنے بری اور بحری راستوں پر قبضہ ہے؟ یا مسلمان کی زمین کے راستے غیروں کے قبضے میں ہیں۔ شاید اس کے جواب میں مسلمان کہہ بیٹھیں کہ عراق، عرب شام اور فلسطین پر مسلمانوں کا قبضہ ہے۔ عرب سلطان ابن سعود خلد اللہ ملکہٗ کے زیر اختیار و تصرف ہے۔ میں کہوں گا عرب کے مغربی کنارہ جنوبی سمندر، مشرقی خلیج فارس اور بحر عمان وغیرہ کس کے قبضہ میں ہیں؟ فلسطین اور شام کس کے زیر نگیں ہیں؟

سمندری راستوں پر تو مسلمان کا روپیہ بس سے ایک پائی حصہ نہیں ہے۔ گویا مسلمان چاروں طرف سے محصور ہے۔ اور عراق کے ہوائی اڈے۔ شام کے ہوائی اڈے۔ عراق کا مٹی کا تیل اور عرب کے معدنیات اور اُن کے راستے کس کے قبضہ میں ہیں؟ شاید کوئی کہہ دے کہ ایران، افغانستان اور ترکی پر مسلمان قابض ہیں۔ اوّل تو اِن علاقوں کی نسبت کرۂ ارض سے ہے کیا! اور یہ قطعات بھی تو صرف ایشیاء کے اندر ہیں۔ اس ترکی کا ایک چھوٹا سا رقبہ استنبول (ترکی روم) بھی ترک کے قبضہ اتفاقاً میں ہے۔ ویسے یورپ میں مسلمان کس بھاؤ زندگی بسر کر رہا ہے؟ برطانیہ میں مسلمانوں کا کتنا حصہ ہے! امریکہ میں مسلمان کس پائی میں ہے؟ افریقہ میں سوائے مصر کے جو کامل آزاد نہیں اور جس کی نہر سویز تک رہن ہے اور دیگر بندرگاہوں پر غیروں کا قبضہ ہے اور کس ٹکڑے پر مسلمان کا تصرف ہے؟ افریقہ کے تمام سواحل اور بحری راستوں سے مسلمانوں کا کیا تعلق ہے؟ اس کا جواب واقعات دیجئے۔ علماء مساجد اور خانقاہوں کے سجادہ نشینان ایک نظر ادھر دیکھ لیں۔ اگر ان کو تسبیح و مدرسیں سے فرصت ہو۔ اگر جغرافیہ پڑھنا گناہ نہ سمجھا جائے۔ خلاصہ یہ کہ بری اور بحری راستوں کی نگرانی مسلمانوں کا ایک فرض ہے۔

(۴) "اس نے تمہارے لئے پہاڑوں میں رہنے کے صحت افزا مقامات بنائے" (نحل) پہاڑوں میں صحت افزا مقامات خدا تعالیٰ کے سپاہیوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کا سپاہی مسلمان ہے اُسے ضرورت ہے کہ وہ خاص خاص موسم میں صحت افزا مقامات میں رہنے کے لئے پہاڑوں پر چلا جائے۔ گویا پہاڑوں کی نگرانی اور صحت افزا مقامات کی حفاظت اور ان پر رہائش مسلمان کا فرض ہے۔

(۵) "اس نے بنایا تمہیں زمین میں پیچھے رہنے والے" (الانعام) "اس نے بنایا تمہیں زمین میں پیچھے آنے والے" (فاطر) "یاد کرو جب اس نے تمہیں ہی خلفاء بنایا۔" (الاعراف)

اِن آیات سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جو تمام دنیا کے بعد زمین میں سب سے پیچھے آنے والی اور سب سے پیچھے رہ جانے والی ہے۔ ان کے بعد ان کی بجائے کوئی قوم نہیں آسکتی۔ گویا مسلمان دنیا کی آخری قوم ہے اور یہی قوم خلافت کی حق دار ہے۔ اسی کو خدا تعالیٰ نے خلفاء اور خلائف کا لقب دیا ہے۔ سو خلافتِ الٰہی کا نمائندہ 'خلیفہ' ہونے کا صحیح حقدار مسلمان ہی ہے۔ اور خلیفہ کا کام یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے احکام کی دنیا سے اطاعت کرائے۔

گویا مسلمان کو زمین کے ہر حصے میں آباد ہونا چاہئے اور تمام زمین کا نظم و نسق مسلمان کے ہاتھ میں رہ سکتا ہے۔

سو تمام زمین کی آبادی اور نظام مسلمان کے فرائض میں داخل ہے۔ مگر آج مسلمان کس رنگ میں ہے؟ اس کا جواب دُنیا بتلائیگی ۔ جو گھر کی چار دیواری کی حفاظت سے بھی قاصر ہے وہ کب زمین کے کسی حصّے کی نگرانی اپنے ذمے لے سکتا ہے؟

(۶) اور وہ وہ ہستی ہے جس نے بنایا تمھارے لئے جو کچھ زمین میں ہے (البقرہ)

معلوم ہوا کہ ما فی الارض جمیعًا سب کا سب مسلمانوں کے لئے ہی بنایا گیا ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی نگرانی کرکے اس کے بجا استعمال کے لئے پوری جدّ و جہد کرے۔ خود بے جا استعمال نہ کرے اور دوسروں کو بے جا استعمال نہ کرنے دے۔

مسلمان سے مواعیدِ الٰہی

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور عمل میں لائے صالحات۔ کہ وہ (الف) ضرور بنائے گا ان کو زمین میں خلیفہ جیسا کہ بنایا خلیفہ ان کو جو ان سے پہلے تھے۔ اور کہ (ب) ضرور مضبوط کرے گا ان کے لئے اُن کے دین کو جس کو پسند کیا ان کے لئے۔ اور کہ (ج) ضرور تبدیل کر دے گا ان کو اُن کے خوف کے بعد امن۔ (ان کا کام یہ ہے کہ) وہ عبادت اور غلامی کرینگے میری (یعنی میری حکومت کو تسلیم کرکے میری حکومت ہی لوگوں سے منوائینگے) اور نہ شریک کرینگے میرے ساتھ کسی شئے کو (خواہ وہ انسان ہو خواہ غیر انسان) اور جو کفر کرے اس کے بعد پس وہ ہی فاسق ہیں۔ اور (تم کو خلافتِ ارضی مل جائے تو) تا قائم کرو الصّلوٰۃ کو (اجتماعی زندگی بسر کرو۔ خدا کے وقار کو قائم کرو۔ آپس کی وحدت کو، وحدتِ جماعت اور وحدتِ امیر سے ظاہر کرو) اور ادا کرو الزّکوٰۃ کو (مال اخراجات سے قومی کمزوریوں کو دور کرو) اور اطاعت کرو الرّسول کی تاکہ تم کو پیار کیا جائے (تم خدا کے رحم کے مستحق بنو) اور یہ کافر لوگ، سو کافروں کو تم ہرگز زمین میں عاجز کرنے (اور مسلمانوں کو شکست دینے) والا مت خیال کرو۔ اور (یہ حقیقت ہے کہ) ان کا ٹھکانا آگ ہے اور ضرور بُرا ہے ٹھکانا) (النّور)

یقینًا خدا کے وعدے صرف کھیل کھلونے نہیں ہیں۔ اصلی اور سچے ہیں (کان وعدہٗ ماتیا۔ کان وعدہٗ مفعولًا۔ ولن یخلف اللہ وعدہٗ) قرآن کریم میں خدا تعالیٰ کے وعدوں کی پختگی پر نصِ صریح ہیں۔ مگر کیا مسلمانوں میں آمنوا خدا تعالیٰ سے ایمان رکھنے والے یا امن کی اشاعت کرنے والے اور اس کے بعد الصالحات تمام صلاحیت ارضی والے کام جو ارضی وراثت کے لئے ضروری ہیں (یرثھا عبادی الصّالحون) کرنے والے موجود ہیں اور ارض کے کسی حصّہ میں بھی مسلمانوں کو وراثت حاصل ہے۔ اور پھر وراثتِ ارضی اور خلافت کے بعد تمکینِ دین میسّر ہے؟ اور خوف دور ہو کر امن میں تبدیل ہو گیا ہے؟ اور مسلمان کے ایمان اور عمل الصّالحات کے بعد مسلمان میں عبادتِ الٰہی

اور غلامی کا صحیح جذبہ موجود ہے ؟ اور مسلمان غیر اللہ اور ماسوا کی حکومت کا قائل اور عامل ہو کر خدا تعالیٰ کا مشرک نہیں ہے!

ہاں ! خلافتِ الٰہی اور وراثتِ ارض کے بجائے اقامت الصلوٰۃ کی ظاہری رسم موجود ہے۔ اور مسلمان کا

دائم تشہد پڑھتے وقت وعلیٰ عباد اللہ الصالحین کے صحیح تصور سے بے خبر ہے۔ ان فی ذالک لاٰیات لقوم یعقلون

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کی قرآنی تمثیل

(حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں مضبوط اور شدید ہیں کافروں کے مقابلہ میں اور

رحم اور پیار کرنے والے ہیں آپس میں (اے مخاطب) تو دیکھے گا اُن کو رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، طلب

کرتے ہیں (اور کریں گے) اللہ تعالیٰ سے فضل اور رضامندی۔ شناخت اُن کی اُن کے چہروں میں سجدوں کے اثر سے ہو گی

یہی ہے مثال اُن کی توراۃ میں۔ اور مثال اُن کی انجیل میں مثل کھیتی کے جس نے نکالا اپنا سوئی کو پھر اس کو موٹا کیا

تو وہ مضبوط ہو گئی۔ پس برابر اور سیدھی ہو گئی اپنی پنڈلی پر۔ خوش کرتی ہے کسانوں کو تاکہ غصہ میں ڈالے ان (کسانوں)

سے کافروں کو۔ وعدہ ہے اللہ تعالیٰ کا ایمان لانے والوں سے اور جو عمل میں لائے الصالحات تم میں سے مغفرت

اور اجر عظیم کا۔ (الفتح)

کیا مسلمان، رسول کی محبت کے دعویدار بروئے نصِ قرآن کریم کفار اور بیگانوں کے مقابلہ میں اشداء

ہیں ؟ اور اپنوں یعنی مسلمانوں کے درمیان رحم اور پیار کی زندگی بسر کرنے والے ہیں ؟ اور اُن کی مثال توراۃ

انجیل کی تمثیل کے مطابق لہلہاتی کھیتی کی سی ہے ؟

مسلمان کا اشداء علی الکفار ہونا اس کی 'خودی' ہے اور رحماء بینھم اس کی 'بے خودی'

صحیح تصویر ہے۔ میر ولی اللہ صاحب ایبٹ آبادی فرماتے ہیں :-

اگر دشمن نسازد[1] با تو اے دوست — ترا باید کہ با دشمن نسازی

اشداء علی الکفار می باش — کہ یک غازی بہ از صد فخر رازی

مسلمان کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے لکھت (کتاب)

(۱) ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں ذکر کے بعد

'الارض' وارث ہوتے ہیں اس کے (اور ہوں گے) میرے صالح بندے۔ بلاشبہ اس میں بلاغ (پیغام) ہے

---

[1] یہ شعر کی تقلید کی گئی ہے جو اس طرح زبان زد ہے۔ " زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز " ۱۲

عام لوگوں کے لئے۔ (الانبیآء)

اللہ تعالیٰ کی کتاب ' (لکھت) یہ ہے کہ وراثتِ ارضی ان کو ملے گی جو صالح ہونگے اور عابد لوگوں کے لئے اس میں تبلیغ ہے۔ 'عابدوں' کو چاہئے کہ وہی 'صالح' بن کر وراثتِ ارضی حاصل کریں۔

'مسلمان' کی غلامانہ ذہنیت نے اس جگہ 'الارض' کے معنیٰ 'جنت' کر کے 'صالحون' کے معنی نیک 'عبادت گذار اور تہجد خواں' مراد لئے ہیں۔

(۲) "اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ ضرور میں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ قوت والا عزیز ہے۔ نہیں پائے گا تو لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں ساتھ اللہ اور یوم آخر کے کہ وہ دوستی رکھیں اس سے جو مقابلہ کرے اللہ اور اس کے رسول سے۔ اگرچہ وہ ان (مومنوں) کے باپ ہوں یا بیٹے۔ بھائی ہوں یا رشتہ دار۔ وہی لوگ لکھ دیا اس نے ان کے دلوں میں ایمان اور تائید کی ان کی ساتھ کلام اپنے کے اور داخل کرے گا اُن کو جنات (باغوں) میں بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں۔ ہمیشہ رہیں گے ان میں۔ راضی اور خوش ہے اللہ تعالیٰ اُن سے اور وہ راضی ہیں اس سے وہی اللہ کا گروہ ہے۔ سنو سنو۔ بلاشبہ اللہ کا گروہ ہی مفلح (کامیاب) ہے (المجادلہ)

ان آیات سے دو باتیں مکتوب معلوم ہوتی ہیں۔ ایک اللہ کی کتاب لکھنے اور رسولوں کے غالب رہنے کی۔ جب خدا اور رسول غالب رہیں گے تو یقیناً خدا اور رسول کے ماننے والے بھی غالب رہینگے۔ ورنہ خدا اور رسول کے غالب رہنے کے کوئی معنے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے مسلمان جب غالب ہی اور اُس کا غلبہ بھی لکھا ہوا اور مکتوب ہے تو وہ کبھی اُن لوگوں سے جو اللہ اور رسول سے مخالفت رکھتے ہوں دوستی نہیں رکھ سکتا۔ خواہ وہ مخالف اُن کے باپ، بیٹے، بھائی یا رشتہ دار کیوں نہ ہوں۔ اور ایسے لوگوں کے دلوں میں اللہ نے لکھ دیا ہے ایمان۔ اور ایسے لوگ ہی جنات میں داخل کئے جائینگے جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی۔ اور یہی اللہ کا گروہ ہے اور یہی گروہ ہی کامیاب گروہ ہے۔

(۳) لکھ دیا گیا تم پر "قتال" (خدا کی راہ کو محفوظ رکھنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دینا) اور وہ ناگوار ہے تمہیں۔ (کیونکہ تمہیں جینا منظور ہے اور مرنے سے تم ڈرتے ہو) مگر ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ اچھی ہو تمہارے لئے۔ اور ہو سکتا ہے کہ محبوب سمجھو تم کسی چیز کو اور وہ بُری ہو تمہارے لئے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے (کہ کون چیز اچھی ہے اور کون بُری)

اور تم نہیں جانتے (بقرہ) اس لئے تم اگر قتال فی سبیل اللہ کو اچھا نہیں جانتے تو تمہارا اچھا نہ جاننا تمہاری بے علمی پر دلالت کرتا ہے۔ خدا کے علم کے پیچھے لگ کر اس کی اچھی چیز کو اچھی سمجھو اور اس کی بری قرار دی ہوئی کو بری۔

قتال کی غرض و غایت کیا ہے؟ میں نے ترجمہ میں واضح کر دیا ہے کہ خدا کی راہ کو محفوظ رکھنے یا دنیا کو خدا کی راہ پر چلانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانا، اور خدا کی راہ کی حفاظت میں ہر ممکن جدوجہد دراصل انسانی خودی کی بہترین ضمانت ہے۔ خدا کے انکار میں ہزاروں کے آگے سر جھکانے سے خودی کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ ہر غیر اللہ معبود بن کر انسان کو اپنا ساجد اور عابد بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

خلاصہ: مسلمان خودی کا ضامن ہے۔ خودی کا محافظ ہے۔ اس خودی کی حفاظت میں نماز و روزہ وغیرہ کے علاوہ "قتال" اس پر لکھ دیا گیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے بھی مسلمان کی عزت اور غلبہ کی ضمانت کی گئی ہے۔ اور مسلمان ہی کے لئے خلافتِ الٰہی اور وراثتِ ارضی کے مواعید کے ساتھ تمکینِ دین اور تبدیلِ خوف بالامن اور نہروں والی جنات لکھ دی گئی ہیں۔

(مشتاق احمد افغان)

مسلمان اور سائنس

جناب ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر ریاضی ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی علمی دنیا میں شہرت کی اس بلندی پر پہنچ چکے ہیں جس نے انھیں کسی رسمی تعارف سے بے نیاز کر دیا ہے۔ یہ گوہر آبدار ہم پتھر کے ڈھیروں کے اندر پڑا تھا کہ نقادانِ مغرب کی نگہ جوہر شناس نے اسے بھانپا اور باوجود اس روایتی بخل کے جو اہلِ مشرق سے بالعموم اور مسلمانوں سے بالخصوص روا رکھا جاتا ہے، سال گذشتہ آپ کو نوبل پرائز کا حقدار قرار دیدیا۔ نوبل پرائز نے ڈاکٹر صدیقی صاحب کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں کر دیا۔ ان کا جوہر ذاتی ہے۔ اس لئے وہ اس سے پہلے بھی ایسے ہی گرانمایہ صاحب علم و فضل تھے جیسے اس کے بعد۔ البتہ اہلِ مغرب کا ہم پر یہ احسان ضرور ہے کہ ان کی وساطت سے ہم اپنی اس متاعِ گرانبہا سے شناسا ہو گئے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا علم سائنس کچھ کم قدر کے قابل نہیں۔ لیکن جس چیز کی بناء پر ہمارے دل میں ان کی قدر و عظمت ہے وہ یہ ہے کہ علوم حاضرہ پر اتنی بسیط دستگاہ رکھنے کے ساتھ وہ قرآنِ حکیم کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ آج جبکہ یہ حالت ہے کہ ہمارا ہر وہ نوجوان طالب علم جو شکسپیئر اور ملٹن کی چار سطریں پڑھ لے مذہب اور اس کے متعلقات کو استہزاء انگیز دقیانوسیت خیال کر کے بزعم خویش روشن خیال لیکن درحقیقت اپنی تنگ ظرفی کا ثبوت دیتا ہے۔ علوم جدیدہ کی اس بلندی پر پہنچ کر مذہب سے شیفتگی خدا کی موہبتِ عظمیٰ ہے۔

پھر یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ ڈاکٹر صدیقی صاحب کو سائنس اور قرآن سے اس قدر وابستگی کیوں

اور یہ چیز حضرت علامہ اقبالؒ سے عقیدت کا موجب نہ بن جائے۔ ہمیں خوشی ہے کہ جناب صدیقی صاحب پیامِ اقبال کے والہانہ شیدائیوں میں سے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی دین ہے۔

اتنے بڑے ریاضی داں ہونے کے باوجود شعروادب کو دلچسپی جناب صدیقی صاحب کے حسنِ ذوق کی آئینہ دار ہے ورنہ ہم تو یہی کہتے تھے کہ ریاضی ایسا خشک علم ہے کہ اس کی تحصیل کے بعد اچھا بھلا آدمی ڈاکٹر ضیاءالدین بن جاتا ہے۔

قرآن سے وابستگی اور حضرت علامہ سے حسنِ عقیدت یہ وہ نسبتیں تھیں جو ڈاکٹر صدیقی صاحب کو طلوعِ اسلام کی طرف گوشۂ چشمِ التفات مبذول کرانے کیلئے ہماری لئے جرأت آفریں ہوگئیں۔ جس شگفتگی اور بشاشت سے جناب صدیقی صاحب نے ہماری استدعا کو شرفِ باریابی عطا فرمایا، وہ ان کی وسعتِ نگاہ کی زندہ دلیل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لاہور کے مسلم کلچرل ایسوسی ایشن میں "مسلمان اور سائنس" کے عنوان پر انگریزی میں ایک مقالہ پڑھا تھا، انھوں نے اس مقالہ کے ضروری اقتباسات کو اردو کے پیکر میں طلوعِ اسلام کے لئے مرحمت فرمایا ہے جس کے لئے ہم ہرتن سپاس ہیں۔ اور یہ تمام زحمت اس وقت گوارا فرمائی جب آپ ناسازیٔ طبیعت کے باعث کوڈائکنال میں صاحبِ فراش ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالےٰ ملتِ اسلامیہ کے اس قابلِ فخر نونہال کو ہر مخالف ہوا کے جھونکے سے محفوظ رکھے۔

حضرت علامہ اقبالؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف "تشکیلِ جدیدہ" ابتک کتابِ مکتوم کی حیثیت سے رکھی ہے۔ بہت کم لوگ اس کے فلسفیانہ غوامض کے سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ ہم نے جناب ڈاکٹر صدیقی صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ اس کتاب کے اہم مباحث کو مسلمانوں کو شناسا کرائیں تو یہ ایک بہت بہتر خدمت ہوگی۔ بارے الحمد کہ انھوں نے اس کا بھی وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت و مہلت عطا فرمائے کہ وہ اپنی گوناگون مصروفیتوں کے باوجود ان امور کی طرف توجہ دینے کے قابل ہوں۔ (طلوعِ اسلام)

جب ہم مغرب کے کسی مصنف کی لکھی ہوئی تاریخ سائنس کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ اس تاریخ کی ابتداء اہل مصر اور اہل بابل کے وقت سے کی جاتی ہے جنھوں نے اب سے تقریباً پانچ ہزار برس قبل منظم طور پر علم کا ذخیرہ فراہم کرنا شروع کیا تھا۔ اس کے بعد مصنف علم کی اس ترقی کا ذکر کرتا ہے جو مصری اور بابلی تہذیب و تمدن کے جانشینوں نے کی۔ یونانیوں اور رومیوں کے زرین عہد کے کارناموں کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ طویل ابواب اہل یونان کے انکشافات کے ذکر کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ اور پھر مصنف یکایک ایک جست کرتا ہے اور اپنی اس چھلانگ میں تقریباً ایک ہزار برس طے کر جاتا ہے۔ ابھی ہم ایک صفحہ پر اس نظام شمسی کا ذکر پڑھ رہے تھے جس کو بطلیموس نے چوتھی صدی عیسوی میں پیش کیا تھا اور ورق الٹنے پر ایک دم ہماری نظروں کے سامنے کوپرنکس کا بیان ہوتا ہے جس کا زمانہ چودھویں صدی کا ہے۔ گویا مصنف کے نزدیک یہ درمیانی ہزار برس سائنس کی تاریخ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہمارے ذہن جو قدرت میں ہر جگہ تسلسل اور تدریجی ارتقاء کو دیکھنے کے عادی ہیں، اس عدم تسلسل کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ کوئی سمجھدار انسان جو ہماری نوع کے ارتقاء کی تاریخ سے واقف ہو اس کو قبول نہیں کر سکتا کہ دس صدیوں تک انسانوں نے قدرت کے علم میں کوئی ترقی نہیں کی۔

زمانۂ حال کے سائنسی مورخوں کو جب اس فروگذاشت کا احساس ہوا تو ان میں سے جو لوگ کسی قدر کم متعصب اور تنگ نظر تھے انھوں نے اعتراف کرنا شروع کیا کہ اس درمیانی ایک ہزار برس میں عربوں اور دوسری مسلمان قوموں نے علم کی شمع کو روشن رکھا۔ لیکن ایک عرصہ کی تنگ نظری اور تعصب سے چونکہ یہ لوگ بھی اپنے دل و دماغ کو پوری طرح پاک صاف نہیں کر سکے اس لئے اس اعتراف کے باوجود وہ یہی کہتے رہے کہ مسلمان اقوام میں اُپج کچھ نہیں تھی اور نہ انھوں نے کوئی بڑے انکشافات کئے۔ بلکہ ان کا کارنامہ صرف اسی قدر ہے کہ انھوں نے اپنے پیشروؤں کی معلومات کو زندہ رکھا اور نشاۃ ثانیہ کے بعد اس کو جوں کا توں یورپی اقوام کے حوالہ کر دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ چند مستشرقین کے سوا یہ مورخ، مصنف یا عوام، مسلمانوں کی تحریروں اور اصلی ماخذوں پر دسترس نہیں رکھتے۔ مسلمانوں کے کارناموں اور ان کے تہذیب و تمدن کے متعلق معلومات

حاصل کرنے کے لئے یہ لوگ اِن تحریروں پر بھروسا کرتے رہے جو صلیبی جنگوں کے زمانہ میں اور اس کے بعد پادریوں اور اربابِ کلیسا نے گھڑی تھیں۔ ان پادریوں نے اپنے مخالفین کی برائی کرنے میں اور واقعات کو غلط روشنی میں بیان کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تاکہ عیسائی اقوام کی ہمدردی اور امداد حاصل کرسکیں بعد کے مورخوں اور مصنفوں نے انہی پادریوں سے اپنا مواد حاصل کیا۔ اور وہی واقعات اس روشنی میں دہراتے چلے گئے جو اربابِ کلیسا نے گھڑے تھے۔

حال میں سائنسی تاریخ میں ایک اور رجحان پیدا ہو چلا ہے جس سے مُسلم عوام کم واقف ہیں۔ یہ گویا ایک قسم کی منظم سازش ہے جو متمدن دنیا میں مسلمانوں کے خلاف پھیل رہی ہے اور اگر وقت پر اس کا سدِ باب نہ کیا گیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ سائنس کی تاریخ سے مسلمانوں کا نام حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ مسلمانوں کے جن انکشافوں اور کارناموں سے اب تک ان کے بدترین دشمن بھی انکار نہیں کرسکتے تھے انہی انکشافوں کا سہرا اب بتدریج دوسرے لوگوں کے سر رکھا جارہا ہے۔ اگر ہم افراد اور قوموں کی نفسیات پر غور کریں تو اس رجحان کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ بعض افراد اس مُربی کے بارِ احسان کو برداشت نہیں کرسکتے جس کی طاقت اور ثروت زائل ہو چکی ہو۔ یہ لوگ ہر قسم کی ممکنہ کوشش اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کرینگے کہ اُن کی گردن پر اس مربی کا کوئی احسان نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس مُربی کے انتقام لینے کی بھی کوشش کرینگے کہ اس نے اپنے احسان سے انھیں نادم کیا تھا۔ اقوام کا بھی یہی حال ہوتا ہے اور ہم کو خود اپنے زمانہ میں اس کا تجربہ ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں نازی جرمنی میں اور دوسرے فاسسٹی ملکوں میں یہودیوں کے خلاف جو جذبۂ نفرت بھڑکا ہوا ہے اس کی اقتصادی اور سیاسی وجوہ کے علاوہ یہی نفسیاتی وجہ بھی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ پھر کیا تعجب ہے اگر قوموں کی قومیں مسلمانوں سے انتقام لینے پر تُلی ہوئی ہیں کہ ہزار برس تک وہ ذہنی اور سیاسی حیثیت سے ساری دنیا پر چھائے رہے۔

اس مختصر مضمون میں ہم اس کی بہت سی مثالیں نہیں پیش کرسکتے۔ صرف ایک واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرینگے۔ موریٹز کانٹور نے جرمن زبان میں علوم ریاضی کی ایک نہایت ہی جامع اور مستند تاریخ لکھی ہے جو چار ضخیم جلدوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ جب عربوں کا بیان آتا ہے تو وہ اس باب کو یوں شروع

کرتا ہے؟ یہ وہ لوگ تھے جو صدیوں تک اپنے ہمسایوں کے تمام تہذیب و تمدن کے اثرات کے اسیر تھے جنھوں نے خود اس تمام عرصہ میں دوسروں پر کوئی تمدنی اثر نہیں ڈالا۔" پھر یکایک ان لوگوں نے اپنا مذہب اپنے قانون اور اپنی زبان کو دوسری قوموں پر اس حد تک مسلط کیا جس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ سب کچھ اس قدر غیر معمولی واقعات ہیں کہ ان کی وجوہات کا کھوج لگانا بے سود نہیں۔ میرا یقین ہے کہ ذہنی بلوغ اور پختگی کا یہ دفعتاً ظہور بذاتِ خود ناممکن ہے۔" دوسرے الفاظ میں کاننٹوڈ کا یہ مطلب ہے کہ عربوں میں یہ ذاتی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اس ذہنی بلندی پر آپ سے آپ پہنچ سکتے۔ اس ایقان کو اپنے دماغ میں جا کر وہ عربوں کی تاریخ ریاضی تحریر کرتا ہے اور محمد بن موسیٰ الخوارزمی اور دوسرے مسلمان علماء علماء کے کارناموں کو یونانیوں اور دوسری قوموں کے آغوش میں ڈال دیتا ہے۔ پھر ہمارے بعض بھائی بندوں کو اس تنکے کا سہارا مل جاتا ہے اور وہ کاننٹوڈ کے اور اسی کی ذہنیت رکھنے والے مغربی مورخین کے حوالہ سے مسلمانوں کے تمام کارناموں کو اپنے ہم قوم افراد سے منسوب کرنے لگتے ہیں۔

ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس قسم کا استدلال ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے کہ اگر تاریخی تحقیق میں اس کو عام طور پر استعمال کرنے کی اجازت ہو جائے تو اس کی مدد سے بڑی سے بڑی شہرت کو معدوم کر دیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال کے لئے فرض کیجئے کہ آئندہ زمانہ کا کوئی ناقص مورخ بیسویں صدی کی سائنس تاریخ لکھ رہا ہے اور پہلے ہی سے اپنا ایک اصول متعین کر لیتا ہے کہ آئن سٹائن اور اس کے ہم عصر علماء کیلئے یہ ناممکن تھا کہ وہ نظریۂ اضافیت کو آپ ہی آپ دریافت کرتے۔ اس لئے آئن سٹائن نے اس نظریہ کو لازماً متقدمین سے نقل کیا ہوگا۔ اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے یہ مورخ وسطی زمانے کے مسودوں کا مطالعہ کرتا ہے اور نہایت فخر و مباہات کے ساتھ ذیل کے اشعار پیش کر کے دنیا کو متحیر کر دیتا ہے:۔

"چوں زبانہ شمع پیشِ آفتاب — ہست باشد نیست باشد در حساب
ہست باشد ذات او تا تو اگر — سر نہی پنبہ بسوزد آن شرر
نیست باشد روشنی ندھد ترا — کردہ باشد آفتاب او را فنا

در دو صد من شہد یک اوقیہ زِ خل | چوں در افگندی و در وے گشت حل
نیست باشد طعمِ خل چوں می چشی | ہست آں اوقیہ فزوں چوں مے کشی۔"

مورخ موصوف ان اشعار کو مولانا روم کی مثنوی سے نقل کر کے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ نظریۂ اضافیت کو آئن سٹائن سے بہت قبل یعنی بارھویں صدی میں عربوں نے دریافت کر لیا تھا۔ کیونکہ ان اشعار میں اصولِ اضافیت کو صاف الفاظ میں مثالوں کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس استدلال کو اور اس سے اخذ کئے ہوئے نتیجہ کو ہم مضحکہ خیز سمجھیں گے۔ پھر ان لوگوں کو ہم کیا کہیں جو اسی قسم کی نام نہاد دلیلیں پیش کر کے تمام انکشافات اور دریافتوں کا سہرا اپنے ہم مذہب اور ہم قوم افراد کے سر رکھنا چاہتے ہیں۔ جہاں کہیں کسی پتھر پر لکھی ہوئی کوئی پرانی تحریر مل گئی خواہ وہ کتنی ہی مبہم اور غیر واضح ہو فوراً دعویٰ کر دیا جاتا ہے کہ اتنے ہزار سال یا صدیوں قبل ان کے فلاں ہم قوم نے ریاضی اور سائنس میں یہ انکشاف کر لیا تھا۔ راقم الحروف کو اس ذہنیت کے بعض افراد کی تقریروں اور تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سائنس اور ریاضی کی تمام جدید ترین معلومات ان کی قدیم مذہبی اور غیر مذہبی کتابوں میں پہلے ہی سے درج ہیں!! ہم سنتے آئے تھے کہ قدیم شاعروں کے کلام کی شرح کرتے وقت لوگ انکے اشعار میں ایسے ایسے معنی دریافت کرتے ہیں جو بچارے شاعروں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ سائنس کے مذکورہ بالا مورخین کی تحریروں کو پڑھ کر ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ یہ چیز شعر و شاعری سے آگے بڑھ کر اب علوم و فنون میں داخل ہو رہی ہے۔

غرض یہ کہ اغیار جان توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے کارناموں کو اپنا کر علم و حکمت کی تاریخ سے مسلمانوں کا نام نکال دیا جائے۔ پیسہ کی ان کے ہاں کمی نہیں اور پریس ان کے ہاتھ میں ہے اخباروں میں آرٹیکل اور رسالوں میں مضامین نکلتے ہیں۔ آئے دن مقالے اور کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ پھر یہ زمانہ ہی پروپیگنڈے کا ہے جو اپنا ڈھول جس قدر زیادہ پیٹے دنیا اس کو ماننے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن جب غیروں سے توقع ہی نہیں تو ان کی شکایت کیا کی جائے۔ ہمیں تو رونا اپنوں کا ہے جو پہلے ہی سے احساسِ پستی میں مبتلا ہیں اور اب اغیار کے پروپیگنڈے سے بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ سائنس اور

خصوصاً ریاضی کو مسلمان طالب علم ہوا سمجھتے ہیں اور نہ صرف عوام بلکہ پڑھے لکھے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات جم گئی ہے کہ مسلمانوں کو یہ علوم نہیں آتے۔ راقم الحروف کا ذکر جب ایک سرکاری کمیٹی میں ہو رہا تھا تو ایک مسلمان بزرگ نے جو نہایت اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں بڑی متانت سے دریافت فرمایا کہ کیا ان کو اقلیدس کی پانچویں شکل سمجھ میں آتی ہے؟" اس ذہنیت میں مبتلا رہ کر ہم موجودہ طوفانی زمانہ میں پنپنے کی کیسے توقع رکھ سکتے ہیں؟

یہ بھی قسمت کا عجیب پھیر ہے کہ ہمیں اپنے اسلاف کے کارنامے بیان کرنے کیلئے مغربی علماء اور مورخین سے سند لانی پڑتی ہے ورنہ محض ہماری بات یا عربی اور فارسی تاریخوں کی شہادت ہمارے جدید تعلیم یافتہ بھائی کیوں ماننے لگے۔ ان کی تشفی اور اطمینان کی خاطر ہم ایک دو مغربی علماء کی شہادتوں کا لفظی ترجمہ یہاں پیش کر دیتے ہیں۔ سر آلیور لاج جو علم طبیعیات کے ایک بڑے مشہور ماہر تھے اور جن کا ابھی چند مہینے قبل انتقال ہوا ہے اپنی کتاب Pioneers of Science کے صفحہ ۹ پر لکھتے ہیں:۔

"قدیم اور جدید سائنس کے درمیان واحد موثر کڑی عرب ہی تھے۔ یورپ کی سائنسی تاریخ میں تاریک زمانہ (ازمنۂ وسطیٰ) ایک بالکل خلا کے طور پر ہے۔ ایک ہزار برس سے زیادہ عرصہ تک ملک عرب کے سوا اور کہیں کوئی سائنسداں اور حکیم نہیں تھا۔"

امریکی مصنف پروفیسر کجوری (F. Cagori) جنھوں نے ریاضی کی تاریخ پر بہت قابل قدر کام کیا ہے اپنی تاریخ ریاضی میں لکھتے ہیں:۔

"تمدن کی تاریخ میں عرب ایک غیر معمولی منظر پیش کرتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کے گمنام جاہل اور منتشر قبیلے جس کو سلطنت اور جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا دس برس کے اندر مذہبی جوش کی بھٹی میں سے گذر کر ایک طاقتور قوم بن جاتے ہیں اور پھر یہ قوم ایک صدی کے عرصہ میں اپنی حکومت ہندوستان سے لے کر شمالی افریقہ اور ہسپانیہ تک پھیلا دیتی ہے اس فتح و ظفر کے ایک سو سال بعد یہ لوگ علمی معاملات میں دنیا کی رہبری کرنے لگتے ہیں

اور ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اپنے زمانہ کے بڑے عالم بن جاتے ہیں"۔

موسیو سیدیو اپنی تاریخ میں تحریر کرتے ہیں :۔

" مغربی مورخوں نے یورپ کے ہیئت دانوں اور سائنسدانوں کے سر اُن انکشافات کا سہرا رکھا ہے جو ایک عرصہ پہلے عربوں نے کئے تھے۔"

ان میں سے چند انکشافات کا ذکر کر کے وہ اس بیان کو یوں ختم کرتے ہیں :۔

" چھٹی صدی سے سولھویں صدی تک بر اعظم یورپ نے کوئی ہیئت داں نہیں پیدا کیا اس زمانہ میں علم وادب کا سارا میدان عرب مشاہیر سے بھرا ہوا تھا جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ یورپ کا کوئی باشندہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان ہیئت دانوں کے انکشافات اوریجنل ہیں۔ ان انکشافوں سے علمِ ریاضی کی ان ترقی یافتہ اور اعلیٰ قسم کی معلومات کا پتہ چلتا ہے جن کو عربوں نے دریافت کیا تھا"

اِن خارجی شہادتوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی بجائے ہم حضرت اقبالؒ کی اس تضمین کے آخری اشعار نقل کر دیتے ہیں جو انھوں نے غنیؔ کے ایک شعر پر کی تھی :۔

" مگر وہ علم کے موتی جواہر اپنے آبا کے — جو دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن — کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

اب ہم داخلی شہادتوں کی طرف رجوع کریں گے اور دیکھیں گے کہ سائنٹفک تصور کے ابتدا اور ارتقا میں اسلام نے کیا کیا خدمتیں انجام دیں۔ ظہور اسلام سے قبل مشرق قریب اور مغرب کے تمام ملکوں پر کلاسیکی یونانی فلسفہ مسلط ہو چکا تھا اور ہر کسی علمی مسئلہ کے متعلق ارسطو کا قول فیصل سمجھا جاتا تھا۔ یونانیوں کے نزدیک علم حاصل کرنے کا طریقہ خیال اور فکر ہی تھا۔ تجربہ اور مشاہدہ کی ان کے ان کوئی حقیقت نہیں تھی۔ کیونکہ انکے خیال میں تجربہ اور مشاہدہ سے صرف قیاسی علم حاصل ہوتا ہے حقیقی علم حاصل نہیں ہوتا۔ کائنات کے متعلق اُن کا تصور سکونیاتی تھا۔ جس کا ثبوت اُن کی جیومیٹری سے ملتا ہے جس میں حرکت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ انھیں یقین تھا کہ اگر نقطوں، خطوں اور شکلوں کو حرکت دی جائے تو اِن سے

ان کی ہیئت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ نہ صرف سائنس ہیں بلکہ فنونِ لطیفہ میں بھی یونانیوں کا آئیڈیل سکونیاتی تھا۔ چنانچہ جتنے قدیم یونانی مجسمے دستیاب ہوئے ہیں ان میں شکلوں کو سکون اور جمود کی حالت میں بتایا گیا ہے۔

اسلام نے سب سے پہلے یونانیوں کے فلسفہ اور سائنس کے خلاف بغاوت کی۔ اسلام نے لوگوں کو سکھلایا کہ دنیا جیسی بھی کچھ ہے اسی سے کام لو اور اسی کے ساتھ دلچسپی رکھو۔ خواب و خیال کی دنیا کی ایک حقیقت شناس مسلم کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ علامہ اقبالؒ نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ پر جو لکچر دیئے ہیں ان میں اس نکتہ پر تفصیلی بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق کائنات ساکن اور جامد نہیں بلکہ متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ قدرت کے کارخانہ میں سکون ممکن نہیں۔ برگساں نے تخلیقی ارتقار کا جو مفہوم قائم کیا ہے وہ کتاب اللہ میں متعدد مقامات پر موجود ہے۔ چنانچہ خالقِ عالم کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" یونانیوں کے برخلاف کائنات کا یہ حرکیاتی تصور حقیقت کے بالکل قریب ہے۔ اس کے علاوہ تحصیل علم کے طریقوں کے متعلق بھی قرآن نے یونانیوں کی تردید کی ہے جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں یونانیوں کے نزدیک علم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تخیل و تفکر تھا۔ لیکن قرآن مجید نے بتلایا کہ تحصیلِ علم کے دو طریقے اور ہیں۔ ایک تاریخ اور دوسرے مشاہدۂ قدرت۔ انہی دو طریقوں کی علم حاصل کرنے میں ہم اسلامی روح کو اس کی بہترین شکل میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ قرآن کی تلقین ہے کہ اگر حقیقت معلوم کرنا ہو تو چاند سورج اور دوسرے مظاہرِ قدرت کو دیکھو۔ ایک مسلم کا فرض ہے کہ وہ ان نشانیوں پر غور کرے اور ان کے پاس سے اس طرح نہ گذر جائے گویا کہ وہ بہرا اور اندھا ہے۔ ایک آیت میں کہا گیا ہے کہ "اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ" الخ دوسری آیت میں ہے کہ ہم نے اپنی نشانیاں جاننے والوں کے لئے واضح کر دی ہیں۔ غرض بار بار قرآن کریم میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ قدرت کے مظاہر کو دیکھنے سے یقینی علم حاصل ہو سکتا ہے۔ یہیں سے جدید سائنس کی ابتدا ہوتی ہے اور یہی تمام موجودہ علوم و فنون کا بنیادی اصول ہے۔ اگر اسلام نے تجربہ اور مشاہدہ کے اس اصول کو پیش نہ کیا ہوتا تو دنیا ابھی تک افلاطون اور ارسطو کی غلامی میں چکر کھاتی رہتی

اور تہذیب و تمدن کی اس ترقی کا نام و نشان بھی نہ ہوتا جو آج ہمیں سائنس کی بدولت میسر ہے۔ البتہ اس موجودہ سائنسی تہذیب میں بہت سی خامیاں بھی ہیں جن کی وجوہات پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔

ایک عرصہ تک غلط طور پر یہ باور کیا جاتا رہا کہ سائنس میں تجربہ اور مشاہدہ کے طریقہ کو یورپ والوں نے اور خاصکر راجر بیکن نے دریافت کیا۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ یہ ایک قرآنی اصول ہے۔ امام غزالیؒ نے اس کو اپنی لاثانی کتاب "احیاء علوم الدین" میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور فرانس کے مشہور فلسفی اور ریاضی دان دیکارت نے اسکو امام غزالی سے اخذ کیا ہے۔ خود راجر بیکن کی سائنٹیفک تعلیم اندلس کی مسلم جامعات میں ہوئی اور اس پر ابن الہیثم کا بہت گہرا اثر تھا۔ چنانچہ بیکن نے ابن الہیثم کی کتاب "علم المناظر" کو ترجمہ کرکے اپنی تصنیف میں نقل کیا ہے۔ برفو Briffault نے اپنی کتاب aking of humanity میں اس نکتہ کو وضاحت سے بیان کیا ہے اور یہاں ہم اس کے چند جملوں کا ترجمہ نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ برفو کہتا ہے: "راجر بیکن نے آکسفورڈ میں عربی زبان اور عربی سائنس کی تعلیم حاصل کی۔ سائنس میں تجربی طریقہ کو داخل کرنے کا سہرا نہ تو راجر بیکن کے اور نہ اس کے ہمنام (فرانسس بیکن) کے سر ہے۔ راجر بیکن کی حیثیت سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ عیسائی یورپ میں مسلم سائنس اور طریقہ کا حواری ہے اور وہ یہ کہنے سے کبھی نہیں تھکتا تھا کہ عربی زبان اور عربی سائنس سے واقفیت اس کے معاصرین کے لئے حقیقی علم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھی۔ یہ بحث کہ تجربی طریقہ کا موجد کون تھا یورپی تمدن کی ابتداء کے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے کی کوششوں کا ایک جزو ہے۔ بیکن کے زمانے تک عربوں کا تجربی طریقہ یورپ میں عام طور پر پھیل چکا تھا۔ اور بڑے شوق سے سیکھا جاتا تھا۔" (صفحہ ۲۰۰)

آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے "عرب تمدن نے موجودہ دنیا کو جو اہم ترین عطیہ دیا ہے وہ سائنس ہے لیکن یہ صرف سائنس ہی نہیں تھی جس نے یورپ کے مردہ قالب میں دوبارہ جان ڈالی۔ اسلامی تمدن کے دوسرے اور متعدد اثرات نے یورپی زندگی میں روشنی پیدا کی۔" (صفحہ ۲۰۲)

ایک اور مقام پر یہ مصنف رقمطراز ہے "اگرچہ یورپی ارتقاء کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اسلامی تہذیب کا فیصلہ کن اثر نہ پایا جاتا ہو، لیکن اس کا سب سے زیادہ واضح اور سب سے زیادہ اہم اثر اس

اس شعبہ پر پڑا ہے جو موجودہ دنیا کا امتیازی شعبہ ہے اور جس میں ہماری ساری طاقت کا راز مضمر ہے۔ یعنی سائنس اور سائنٹیفک ذہنیت۔ عربوں کی سائنس کا احسان ہماری سائنس پر محض اسی قدر نہیں ہے کہ انھوں نے چند عجیب وغریب انکشافات کئے ہوں یا چند انقلاب انگیز نظریئے پیش کئے ہوں۔ ہماری سائنس عرب تہذیب کی کہیں زیادہ ممنونِ احسان ہے۔ یعنی سائنس کا وجود بھی عربوں کی بدولت ہے۔ جس چیز کو ہم سائنس کہتے ہیں وہ یورپ میں ایک نئی ذہنیت کے تحت پیدا ہوئی۔ یہ ذہنیت تحقیق وتجسس کے نئے طریقوں یعنی تجربوں مشاہدوں پیمائش اور علم ریاضی کے ان نئے طریقوں پر مبنی تھی جن سے یونانی بالکل ناواقف تھے۔ اس ذہنیت اور ان طریقوں کو عربوں نے یورپ میں رائج کیا" (صفحہ ۱۹۰)

غرض یہ امر مسلمہ ہے کہ جدید سائنس کی ابتدا مسلمانوں سے ہوئی۔ اور مسلم تہذیب کا سب سے بڑا عطیہ سائنٹیفک طریقہ اور سائنٹیفک ذہنیت ہے۔

اس اصول کو متعارف کرنے کے بعد مسلمانوں نے علم کی مختلف شاخوں پر اس کا استعمال کیا اور ہر علم میں اہم اور عظیم الشان انکشافات کئے۔ ان سائنسوں میں مشہور حسب ذیل ہیں:- علم ریاضی، علم ہیئت۔ علم طبیعیات، علم کیمیا، علم طبقات الارض، علم طب، فنِ تعمیر، فن جہازرانی وغیرہ۔

یہ ایک ضروری اور اہم کام ہے کہ ان میں سے ہر علم وفن میں مسلمانوں نے جو کارنامے کئے ہیں ان کی ایک مستند اور جامع تاریخ لکھی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے علماء کی ایک جماعت درکار ہے جن میں سے چند فارسی اور عربی زبانوں کے ماہر ہوں اور چند مختلف علوم وفنون کے۔ ان کے اشتراکِ عمل سے یہ کام انجام پاسکتا ہے۔ بہت سا مواد تلف ہو چکا ہے۔ بہت سی کتابیں دنیا کے مختلف کتبخانوں میں بکھری پڑی ہیں اور اس قدر شکستہ اور کرم خوردہ حالت میں ہیں کہ اگر ان سے فوری استفادہ نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ یہ بھی تلف ہو جائیں گی۔ دو ایک اس قسم کی کوششیں پہلے بھی ہو چکی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے کسی کو مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ کانتور نے عربوں کی ریاضی پر اور وسٹن فلڈ نے عربوں کی طبی اور سائنسی کارناموں پر جرمن زبان میں کتابیں لکھی ہیں۔ کارنیگی فاؤنڈیشن کی طرف سے امریکہ میں سائنس کی ایک مبسوط تاریخ لکھی جارہی ہے جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں بھی مسلمانوں کے کچھ کارنامے درج ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا

آف اسلام میں بھی کچھ مواد دیا گیا ہے اور وقت بوقت بعض مستشرقین کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ مئی ۱۹۳۹ء کے رسالہ "پاپولر اسٹرانومی" میں میچیگن یونیورسٹی (امریکہ) کے ایک محقق کارل ایچ نوئن نے یورپ اور مشرق اقصیٰ میں اسلامی ہیئت کا اثر" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یورپ والوں نے اور اہل چین نے مسلمانوں سے علم ہیئت میں کیا سیکھا۔ ایسی منتشر کوششوں کی بجائے بین الاقوامی طور پر منظم کوششیں ہوں تو زیادہ موثر نتیجے برآمد ہو سکتے ہیں۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہم مختلف سائنسوں میں مسلمانوں کے چند اہم کارنامے پیش کریں گے جس سے ان کی قوتِ مشاہدہ، قوتِ استدلال اور قوتِ انکشافات وایجاد کے متعلق داخلی شہادت مل سکے گی۔

نوعِ انسان نے جب شعوری طور پر اپنی گرد وپیش کی دنیا پر غور کرنا شروع کیا تو انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کبھی وہ پتھر اوپر کی طرف پھینکتے ہیں یا تیر چلاتے ہیں تو یہ پتھر یا تیر ہمیشہ زمین پر آگرتے ہیں۔ جب اس واقعہ کو انھوں نے نسلاً بعد نسل دہراتا ہوا دیکھا تو اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کوئی قوت ہر چیز کو زمین کی طرف کھینچتی ہے۔ ابتدائی انسانوں کے نزدیک چونکہ ہر قسم کی قوت صرف دیوتاؤں میں ہی پائی جاتی تھی اس لئے انھوں نے اشیاء کو کھینچنے کی قوت کو زمین کے دیوتا کے ساتھ منسوب کیا۔ بعد میں جب انسانی ذہن نے کسی قدر زیادہ ترقی کی تو انھوں نے ایک اصول بنایا کہ "کُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِهٖ" یعنی ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے اور اسی لئے تمام مادی اشیاء زمین پر گر پڑتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس اصول کو یونانیوں نے رائج کیا تھا۔ چاند، سورج اور دوسرے سیاروں کی حرکت کی توجیہہ کرنے کے لئے بھی اس قسم کی ناکام کوششیں کی گئیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ ان حرکتوں کے متعلق قانونِ تجاذب کو سترھویں صدی میں نیوٹن نے دریافت کیا اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے کہ اس قانون کو ریاضی کی زبان میں بیان کرنے کا اور پھر اس ریاضیاتی قاعدہ سے باضابطہ طور پر سیاروں وغیرہ کی حرکت کی توجیہہ وتشریح کرنے کا شرف نیوٹن ہی کو حاصل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ عالمگیر قانونِ تجاذب کے بنیادی اصول کی جھلک عرب حکماء نے دیکھ لی تھی۔ اور ان کا یہ خیال تھا کہ اجرامِ فلکی کی حرکت اسی باہمی کشش اور تجاذب کی بنا پر ہوتی ہے۔ یہ خیال اس زمانہ میں اس قدر وسعت حاصل کر چکا تھا

کہ اب ادب اور شعر و سخن میں بھی اس کا ذکر ہونے لگا تھا۔ کسی علمی اصول کی ہمہ گیری کا اس سے بڑھ کر اور کوئی معیار نہیں ہو سکتا کہ وہ عوام اور شاعروں کی زبان پر بھی چڑھ جائے۔ چنانچہ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں ایک حکیم اور ایک عامی کے مابین مکالمہ درج کیا ہے جس میں اس عالمگیر تجاذب کی تشریح شاعرانہ پیرایہ میں کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"جملہ اجزائے جہاں زاں حکم پیش | جفت جفت و عاشقانِ جفتِ خویش
ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ | راست ہمچو کہربا و برگِ کاہ
آسماں گوید زمیں را مرحبا | باتوام چوں آہن و آہن ربا"

اس کائنات کا ہر ذرہ ہر دوسرے ذرہ کو اس طرح کھینچتا ہے جیسے کہ کہربا پتھر گھاس کے تنکوں کو کھینچتا ہے۔ آسمان اور زمین دونوں باہم لوہے اور مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔"

پہلے دو شعروں میں قانونِ تجاذب کو تقریباً انہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن کو نیوٹن استعمال کرتا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ مثنوی بارھویں صدی میں لکھی گئی تھی اور نیوٹن کا زمانہ پانچ سو سال بعد کا ہے۔

مولانا روم پھر اس سوال کو اٹھاتے ہیں کہ یہ زمین فضائے بسیط میں کس طرح معلق ہے کہ کسی طرف نہیں گرتی۔ اور اس کی توجیہ اسی عالمگیر تجاذب کی بنا پر کرتے ہیں:-

"گفت سائل چوں بماند ایں خاکداں | درمیانِ ایں محیطِ آسماں
ہمچو قندیلے معلق در ہوا | نے بر اسفل مے رود نے بر علا
آں حکیمش گفت کز جذبِ سما | از جہاتِ شش بماند اندر ہوا
چوں ز مقناطیس قبہ ریختہ | درمیاں ماند آہنے آویختہ"

عام فہم زبان میں قانونِ تجاذب کو اس سے زیادہ واضح طور پر بیان کرنا مشکل ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ مثنوی کے کسی ترجمہ کو پڑھ کر نیوٹن کا ذہن اس قانون کی طرف منتقل ہوا ہو۔ لیکن اس سے نیوٹن کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ نیوٹن کا کارنامہ دنیائے سائنس کے چوٹی کے

کارناموں میں ہمیشہ شمار ہوتا رہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہم یہ بھی نہیں بھول سکتے کہ نیوٹن کے پیشرو کپلر نے جو سولھویں صدی کا بہت بڑا ہئیت داں سمجھا جاتا ہے سیاروں کی حرکت کی توجیہ کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ ہر سیارہ میں ایک رُوح فرض کی جائے، جو اس کو گردش دیتی ہے، اس واقعہ کو ملحوظ رکھ کر مسلم حکماء کی سائنسی ذہنیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو عالمگیر تجاذب کے تصور سے مانوس تھے۔

اوپر کی مثال ہم نے طبیعی سائنس سے دی ہے۔ اب ہم ایک مثال حیاتی سائنس سے پیش کریں گے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ قانون ارتقاء کا انکشاف ڈارون نے انیسویں صدی میں کیا۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ دسویں صدی عیسوی ہی میں یہ تصور بتدریج تشکیل پا رہا تھا۔ جاحظ وہ پہلا حکیم تھا جس نے معلوم کیا کہ پرندوں کے مختلف موسموں میں مختلف مقاموں کو ہجرت کرنے کا اثر ان کی نوع پر کیا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ابن مسکویہ نے اس نظریہ کو باقاعدہ شکل میں پیش کیا۔ اور اپنی کتاب "الفوز الاصغر" میں اس کو تفصیل سے بیان کیا۔ پھر یہ تصور اس قدر وسیع طور پر رائج ہوگیا کہ شعراء اور عوام بھی اس سے مانوس ہوگئے۔ چنانچہ مولانا روم نے حیات بعد الموت کے ثابت کرنے کے لئے اسی قانونِ ارتقاء کو استعمال کیا ہے۔ انسان کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے مثنوی میں فرماتے ہیں ؂

"آمدہ اوّل بہ اقلیم جماد | از جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد | واز جمادی یاد ناورد از نبرد
واز نباتی چوں بحیواں اوفتاد | نامدش حالِ نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں | خاصہ در وقتِ بہار و ضیمراں
ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت | تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت"

مولانا رومؒ اصولِ ارتقا کے اس قدر معتقد تھے کہ انھوں نے بار بار اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک اور مقام پر اس کو مثنوی میں نہایت نفیس پیرایہ میں بیان کرتے ہیں:-

تو از اں روزے کہ در ہست آمدی | آتشی یا خاک یا بادے بدی
گر بداں حالت ترا بودے بقا | کے رسیدے مرترا ایں ارتقا

از مبدّل ہستیِ اوّل نماند — ہستیِ دیگر بجائے او نشاند
ہمچنیں تا صد ہزاراں ہستہا — بعد یک دیگر دوم بہ ز ابتدا
ایں بقاہا از فناہا یافتی — از فنا پس رو چرا برتافتی
زاں فناہا چہ زیاں بودت کہ تا — بر بقا چسپیدۂ اے بے نوا
چوں دوم از اولینت بہتر است — پس فنا جوئے و مبدل را پرست
صد ہزاراں حشر دیدی اے عنود — تاکنوں درلحظہ از بدوِ وجود
از جمادی بے خبر سوئے نما — واز نما سوئے حیات و ابتلا
باز سوئے عقل و تمیزاتِ خوش — باز سوئے خارج ایں پنج و شش
ور فناہا ایں بقاہا دیدۂ — بر بقائے جسم چوں چسپیدۂ
تازہ می گیر و کہن را می سپار — کہ ہر امسالت فزون است از سہ پار"

مغرب میں آجکل بھی اربابِ کلیسا اور سائنس دانوں میں قانونِ ارتقاء کے متعلق تند و تلخ بحث چھڑی رہتی ہے۔ کیونکہ اربابِ کلیسا کا خیال ہے کہ اصولِ ارتقاء انجیل مقدس کی تعلیمات کے خلاف ہے اور اس کی اشاعت نہیں ہونی چاہیے۔ آپ غور فرمائیے کہ آج سے تقریباً آٹھ سو برس قبل مسلم مقتدایانِ دین اس معاملہ میں کس قدر وسیع مشرب رکھتے تھے!

اب دو چار مثالیں علوم ریاضی و ہیئت سے بھی سنتے جائیے۔ عددوں کو حروفِ ابجد کی بجائے ہندسوں سے تعبیر کرنا اور پھر ان میں صفر کا اضافہ کرنا عربوں کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی اہمیت کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ صفر کا استعمال سب سے پہلے محمد بن موسیٰ الخوارزمی کی علمِ حساب والی کتاب میں ہوا ہے جو نویں صدی کی ابتدا میں لکھی گئی تھی۔ الجبرا کا موجد بھی خوارزمی ہی ہے۔ اس کی ابتدا سے دو صدیوں کے اندر ہی یہ علم بہت بڑی حد تک ترقی پا چکا تھا اور اس کو ترقی دینے والوں میں خوارزمی کے علاوہ ابوالوفا' الکوہی' ابوالجود محمد ابن اللیث' ابومحمود الخوجندی' ابوبکر محمد ابن الحسین الکرخی مشہور ہیں۔ عمر خیام نیشاپوری کو دنیا شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے۔

لیکن جیسا کہ مورٹن کانٹور نے شہادت دی ہے اس کا شمار دنیا کے بزرگترین ریاضی دانوں میں ہونا چاہئے۔ یہ ملک شاہ سلجوقی کا خاص ماہر فلکیات تھا۔ اور سال شمسی کے متعلق اس کی تجویز اس سے پہلے اور بعد کی تمام تجویزوں سے بہتر مانی جاتی ہے اور آجتک بھی کسی ہیئت داں نے اس کی بہتر تجویز پیش نہیں کی (کانٹور)

سنہ الہ ءتک عربوں نے ہندسی الجبرا کو اس حد تک ترقی دی تھی کہ بقول کانٹور کے کوئی مغربی عالم ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ کانٹور نے عربوں کے خلاف بہت تنگ نظری سے کام لیا ہے۔ لیکن یہ کارنامے ایسے روشن ہیں کہ وہ بھی ان سے انکار نہیں کر سکا۔

ریاضی کے دوسرے شعبوں یعنی جیومیٹری، علم مثلث اور علم مساحت میں بھی مسلمانوں کے کارنامے اتنے ہی درخشاں ہیں۔ پہلے تو انھوں نے اقلیدس کی جیومیٹری اور اپولونیس کے مخروطی تراشوں کا ترجمہ یونانی زبان سے عربی زبان میں کیا اور اس طرح ان بیش بہا علمی خزانوں کو ضائع ہونے سے بچالیا۔ یونانیوں کے کارناموں پر مہارت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ان علوم میں بہت سے نئے انکشافات کئے۔ موسیٰ بن شاکر کے تین بیٹوں محمدؐ، احمد اور حسن نے ایک زاویہ کے تین برابر حصے کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔ ابوالوفار نے کثیر سطحیوں کے نظریہ میں بہت سے اضافے کئے۔ یہ موضوع آجکل بھی بہت مشکل سمجھا جاتا ہے۔ ابوعلی ابن الہیثم نے بھی جیومیٹری پر بہت کچھ کام کیا۔ علم مناظر پر اس نے جو کتاب لکھی ہے وہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں ابن الہیثم نے ایسے مسئلوں پر بحث کی جن کو حل کرنا اس وقت بھی کافی مشکل ہے۔ راجر بیکن نے اسی کتاب کو ترجمہ کرکے اپنی تصنیف میں شامل کیا تھا۔

علم ہندسہ میں سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامہ ابوجعفر محمدؐ ابن حسن کا ہے جو علامہ نصیر الدین محقق طوسی کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ تیرھویں صدی کے سب سے بڑے عالم اور حکیم تھے۔ فلسفہ، ریاضی، طب اور طبیعی سائنس میں ان کی مہارت یکساں طور پر مسلّم تھی۔ ان کے دوسرے کارناموں سے قطع نظر کرکے اس مقام پر ہم صرف ایک کارنامہ کا ذکر کریں گے۔

ہر تعلیمیافتہ شخص اس امر سے واقف ہے کہ اقلیدس کے مفروضوں میں ایک مفروضہ متوازی خطوں کا

متعلق ہے یعنی ان خطوں سے جو ایک ہی سطح میں واقع ہوں اور کبھی ایک دوسرے سے نہ ملیں۔ خواہ ان کو کتنا ہی خارج کیا جائے۔ دوسری صدی کے یعنی بطلیموس کے زمانہ کے بعد سے کسی نے اقلیدس کے اس متوازی مفروضہ کی شکلوں پر غور نہیں کیا کہ یہ مفروضہ اس قدر واضح بالذات یا قرین قیاس نہیں ہے جس قدر اقلیدس کے دوسرے مفروضے اور نہ اس کو دوسرے مفروضوں کی مدد سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ تقریباً ایک ہزار برس کے بعد طوسی نے اس مسئلہ کی باضابطہ تحقیق کی اور یہ خیال پیش کیا کہ خارجی فضا کو اس مطلق حیثیت میں برقرار رکھنا ممکن نہیں ہے جو اقلیدس کی جیومیٹری میں مان لی گئی ہے۔ طوسی کے خیال کی توثیق اس وقت ہوئی جبکہ انیسویں صدی میں نا اقلیدسی ہندسہ کی تشکیل کی گئی اور جس کی بنا پر اس صدی میں پروفیسر آئن سٹائن نے اپنا نظریہ اضافیت قائم کیا۔ اس بحث کو تفصیل کے ساتھ راقم الحروف کی کتاب "اضافیت" میں پیش کیا گیا ہے۔

علم مثلث میں محمد ابن جابر ابو عبداللہ البطانی کے کارنامے عام طور پر معلوم ہیں۔ یہ حکیم یورپ میں *Albategnius* کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے نویں صدی میں مثلثی تفاعلوں جیب وغیرہ کو پیش کیا اور علم ہیئت میں ان کا باضابطہ استعمال کیا۔ ستاروں کی حرکت پر اس نے ایک مستند کتاب تحریر کی تھی جس کا ترجمہ Plate of Tivoli نے بارھویں صدی میں کیا۔ اس ترجمہ سے لفظ جیب تمام یورپی زبانوں میں داخل ہوا۔ اس سے قبل ہندوستان کے لوگ پورے قوس کا استعمال کرتے تھے۔ لیکن البطانی نے بتلایا کہ پورے قوس کی بجائے نصف قوس کا استعمال زیادہ مفید ہے۔ کانتور کا قول ہے کہ ریاضی میں یہ ایسی ترقی ہے جس کی اہمیت جس قدر جتلائی جائے کم ہے۔

علم ہیئت کو (جو عربوں کے زمانہ میں علم نجوم کے نام سے موسوم تھا) تو عرب اپنا ذاتی اور خاص علم سمجھتے تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ عہد جدید سے قبل کسی اور قوم نے اس علم میں اتنا کام نہیں کیا جتنا کہ عربوں نے کیا ہے البیرونی نے اپنی کتاب "آثار باقیہ" میں ابن خطیبہ کے ایک قول سے اس کی شہادت دی ہے۔ عصر جدید کے عیسائی مورخ جرجی زیدان نے بھی جو مسلمانوں کا بہت سخت مخالف ہے اپنی کتاب تاریخ تمدن اسلامی میں اس کا اعتراف کیا ہے جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے!

تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا میں صرف ایک رصدگاہ اسکندریہ میں موجود تھی۔ اور وہ بھی کچھ زیادہ کام نہیں کر رہی تھی۔ لیکن چند ہی صدیوں کے اندر مسلمانوں نے دمشق۔ بغداد۔ اصفہان انطاکیہ۔ بوزجان۔ مصر۔ مراغا اور کشمیر میں رصدگاہیں قائم کیں۔ جہاں بہترین اور جدید ترین آلات فراہم کئے گئے تھے۔ اسی طرح البیرونی' مسترشد باللہ' بوعلی سینا، البتانی، بنی شاکر، شرف الدولہ، ابو الوفا بوزجانی، مامون بطالہیؒ' تقی الدین' فیروز شاہ بہمنی' الغ بیگ اور محمد شاہ کی رصدگاہیں بھی بہت مشہور تھیں جہاں علم ہیئت پر عدیم النظیر کام ہو رہا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ بغیر صحیح اور نازک آلات کی یہ رصدگاہیں کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ اس لئے انھوں نے بہت سے پرانے آلوں کو ترقی دی۔ اور کئی نئے آلات بھی ایجاد کئے جن میں سے چند مشہور آلوں کا نام یہاں درج کیا جاتا ہے۔ حلقۃ اعتدال' ذات الاوتاد' اصطرلاب، ذات الشعبتین' ذات الجیب' طبق المناطق' زرقالہ' ذات الکرسی' آلۃ الشاملہ' ربع التام' ربع جامعہ' ربع مجیب' ربع مجنح' الجیب الغائب' سدس فخری' ربع ذو الشعب وغیرہ۔ ان آلات کو تفصیل کے ساتھ کشف الظنون' جامع بہادر خانی اور خلاصہ تاریخ العرب' میں بیان کیا گیا ہے۔

علم ہیئت میں مسلمانوں کے کارنامے اس قدر بے شمار ہیں کہ ہم انھیں یہاں مختصر طور پر بھی بیان نہیں کر سکتے۔ ان کا کچھ ذکر اوپر کی کتابوں کے علاوہ شرح چغمینی، اکتفا ما القنوع' تمدن عرب وغیرہ میں دیا ہوا ہے۔ کارل اوفوس کے اس مضمون میں بھی جو پاپولر اسسٹرانومی میں چھپا ہے اور جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے اس کا مختصر ذکر پایا جاتا ہے۔ راقم الحروف کے انگریزی مضمون میں جو جنوری ۱۹۴۱ء کے رسالہ اسلامک کلچر میں شائع ہوا ہے یہ حوالے تفصیل سے درج کئے گئے ہیں۔

مسلمانوں کے اس ایک انکشاف کا ذکر بہر حال ضروری ہے جو نظام شمسی سے متعلق ہے۔ اور جس کو عام طور پر کوپرنیکس کے نام کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ دوسری صدی میں بطلیموس نے ستیاروں کا ایک نظام پیش کیا تھا جس میں مان لیا گیا تھا کہ زمین مرکز پر ساکن ہے اور ستیارے یعنی سورج' چاند' عطارد، زہرہ، مریخ' مشتری وغیرہ زمین کے گرد گھومتے ہیں۔ اس نظام سے ان ستیاروں کی حرکت کی توجیہ تو ہو جاتی تھی۔ اگرچہ یہ توجیہ بہت پیچیدہ تھی۔ لیکن چودھویں صدی میں

کوپرنیکس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ زمین کو مرکز پر ساکن ماننے سے یہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اس لئے بہتر ہے کہ سورج کو مرکز پر ساکن مانا جائے اور زمین اور دوسرے سیاروں کو سورج کے گرد گھومتا ہوا فرض کیا جائے جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ شمس مرکزی نظام کوپرنیکس کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے. حالانکہ بارھویں صدی میں ہی مسلمانوں نے اس کو پیش کر دیا تھا۔ اس کے ثبوت میں ہم دو شہادتیں پیش کریں گے۔ البیرونی نے اپنی کتاب قانون مسعودی میں جو ۱۰۳۱ھ یعنی بارھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں لکھی گئی ہے ایک دوسرے ہئیت داں کی اس رائے کو بیان کیا ہے کہ زمین ساکن نہیں بلکہ حرکت کرتی ہے. چنانچہ البیرونی کی اصل عربی عبارت یہ ہے:-

"اما انا شاهدت احداً من مال الى نصرة هذا الرای من المتنورين في علم الهيئة لم يلتزم نزول الثقل الى الارض على القطر عموداً على وجهها بل منحرفاً على زوايا مختلفة لا تضبط فيه ولا تحفظ غير المسامتة - ان الرجل رای الثقل عن الارض حركتين احداهما دوريه كما في طبيعة الجزء من تقبيل الكل في خواصه والأخرىٰ مستقيمة لانجذابه الى معدنه فالثقيل اذا انفصل عن الارض تتحرك بادلهما حركة يوجب في الهواء لادام المسامتة الواجبة - واما الثانية المستقيمة فيوجب لو تجردت دتوعه عن غرب المسامتة ابداً لكن هوية مركب منهما فلذالك لا ينحرف عن المسامتة والخط الذي ينزل عليه ليس بعمود على الارض بالحقيقة بل مايلي نحو المشرق -"

اس عبارت میں البیرونی اس واقعہ سے بحث کرتا ہے کہ اگر کسی پتھر کو اوپر سے گرایا جائے تو وہ سیدھی عمودی سمت میں نہیں گرتا بلکہ کسی قدر مشرق کی طرف ہٹ کر گرتا ہے۔ اس کی توجیہ میں زمین کی حرکت کو بتلایا گیا ہے۔

دوسری شہادت میں کارل ادفوس کے مولہ بالا مضمون سے ملتی ہے جس میں اس نے بتایا ہے

کہ علامہ نصیر الدین محقق طوسی نے لطلیموسی نظام کی تنقید کی تھی اور اس خیال کو غلط ثابت کیا تھا کہ زمین مرکز پر ساکن ہے۔

مورخ کانٹور نے اپنی تاریخ میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ بارھویں صدی میں فریڈرک ثانی نے ایک خاص وفد کمال الدین کے پاس موصل کو بھیجا تھا کہ چند ریاضی کے مسئلوں کا حل کمال الدین سے دریافت کرلائیں۔ کمال الدین نے اسی وقت بغیر کسی دقت کے ان مسئلوں کو حل کر دیا تھا۔

آجکل تو ہم نہ صرف عملی بلکہ علمی معاملات میں بھی مغرب کے دست نگر ہیں

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

حقائق وعبر

خیر الامم کے مشاغل اللہ تعالیٰ نے وارثینِ کتابِ مبین کو قوموں کی امامت کے لئے پیدا کیا تھا۔ ان کا فریضۂ حیات یہ تھا کہ انسانیت سے متعلق کوئی مشکل سامنے آئے۔ اس کا علمی حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کریں اور یوں تمام اقوام وملل عالم کی قیادت سے ثابت کر دیں کہ نوعِ انسانی میں ہمارا مقام کیا ہے؟ آج اقوامِ عالم جس قیامت خیز ہنگامۂ موت وحیات میں مبتلا ہیں۔ انہیں ملتِ اسلامیہ کا یہی فریضہ تھا۔ لیکن مسلمان کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ دوسروں کی قیادت وامامت تو ایک طرف۔ خود اپنی زندگی کے لئے دوسروں کا رہینِ منت ہے۔ دنیا بھر کی قومیں اس عالمگیر کش مکش میں ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں کہ ان کی فلاح ونجات کی کوئی صورت نکل آئے۔ لیکن دیکھئے کہ اس ہجومِ مصائب وازدحامِ مشکلات میں اس خیر الامم کی اکابرین وعمائد کن اہم مسائل کے بست وکشاد میں معروفِ جہاد ہیں۔ مسلمانوں کی دو بڑی شاخیں شیعہ اور سنی جماعتیں ہیں جن کی تفریق سے ان کی بدبختی کی ابتدا ہوتی ہے، دونوں جماعتیں دو تین برس سے میدانِ کارزار لکھنؤ میں جس اہم فریضۂ جہاد کی تکمیل میں غلطیدۂ خاک وخون ہو رہے ہیں۔ وہ ہر قلبِ درد آشنا کے آنکھوں کے راستے بہ نکلنے کے لئے کافی تھی۔ خود سنیوں میں ایک جماعت اہل حدیث (یا غیر مقلد حضرات کی ہے اور دوسری مقلدین کی۔ مقلدین میں ایک اہل شریعت ہیں اور ایک اہلِ طریقت۔ یہی ان کی بڑی بڑی گروہ بندیاں۔ اب دیکھئے کہ یہ حضرات اپنی اپنی جگہ کن مہمات کے سر کرنے میں مصروف ہیں۔ "اہلِ حدیث" غیر مقلد حضرات کا مشہور اخبار ہے جو مناظرِ اسلام جناب ثناء اللہ صاحب امرتسری کی زیرِ ادارت شائع ہوتا ہے۔ اس میں ایک باب فتاویٰ پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔ اس اخبار کی ۱۳ مئی ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں چند فتاویٰ اور ان کے جوابات شائع ہوئے ہیں۔ غور سے ملاحظہ فرمائیے۔

ارشاد ہے۔

س ۸۹} بیوہ عورت جس کے دو تین چار شوہر یکے بعد دیگرے فوت ہو چکے ہیں اور سب کے سب خوش قسمتی سے جنتی ہوں تو وہ عورت جنت میں کس شوہر کو ملیگی؟ آخری شوہر کو ملے تو قبل والے تین مردوں کو کون سی بیویاں ملیں گی یا وہ دنیاوی بیوی سے محروم رہیں گے؟ بدلائل جواب دیجئے۔ (خریدار اہلحدیث از کلکتہ)

ج ۸۹} اس عورت کی جس خاوند سے زیادہ محبت ہوگی اس کے ساتھ ہوگی حدیث شریف میں آیا ہے المرء مع من احب انسان اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت ہوگی اس کے علاوہ ابن جریر میں ایک روائیت آئی ہے احسنهم خلقا یعنی جس مرد کا سلوک عورت کے ساتھ اچھا ہوگا۔ اس کو ملے گی۔

س ۹۰} بیوی جنتی ہو اور شوہر دوزخی تو اس بیوی کو جنت میں شوہر ملیگا یا نہیں؟ اگر ملے گا تو کون؟ (سائل مذکور)

ج ۹۰} بعض مرد جنتی ہونگے اور ان کی عورتیں غیر جنتی بعض اس کے برعکس تو صورت یہ ہوگی کہ اہلِ جنت کا ساتھ اہلِ جنت کے ساتھ ہوگا اور اہلِ دوزخ کا دوزخیوں سے۔ الطیبات للطیبین الآیہ کے ماتحت اعمال صالحہ کا لحاظ رکھا جائیگا۔

کس قدر اہم مسائل ہیں جن کی حل تلاش ہو رہی ہے۔

اب مقلد حضرات کی طرف آیئے۔ "الفقیہ" بابت ۷ مئی ۱۹۲۸ء میں ایک نظم شایع ہوئی ہے جو قارئین طلوع اسلام کے حسن ذوق سے معذرت کے ساتھ درج ذیل کی جاتی ہے: فرماتے ہیں

ایک دن حضرتِ جبریلؑ امیں لائے پیام ۔۔۔ خدمتِ حضرتِ اقدس میں کیا آکے سلام
باندھے سر پہ عمامہ تھے شہنشاہ دیں ۔۔۔ ہنس کے جبریل کو فرمانے لگے صدر نشیں
اے اخی! یہ تمہیں ملتا ہے کہاں سے پیغام ۔۔۔ بولے جبریل کہ اک پردے سے یا خیر انام
شہ نے فرمایا کہ پردے کو اٹھا کر دیکھو ۔۔۔ کون دیتا ہے پیام آج یہ جا کر دیکھو
سن کے حکم شہ کونین وہ سدرہ کا مقیم ۔۔۔ بہر تعمیل روانہ ہوا باخوف و بیم

آن کی آن میں پرستے کے قریں جا پہونچا | ہاتھ سے پردہ اٹھایا تو نظر کیا آیا
باندھے سر پہ عمامہ نظر آئے سرکار | نکلا آئینے کے پردے میں چھپا آئینہ دار
دیکھ کر وجد میں جبریل اُسے ناآدم آئے | شعر قدسی کا یہ بے ساختہ لب پر لائے

مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

یہ تو پھر اہل شریعت حضرات ہیں۔ اہل طریقت جو بزعم خویش تمام نظام عالم کے تزکیۂ حقیقی کے ذمہ دار اور محکمۂ قضا و قدر میں دخیل ہونیکے مدعی ہیں۔ ان کی بابت بھی ملاحظہ فرمائیے "انوار الصوفیہ" (بابت مارچ ۱۹۱۲ء) میں ایک سرمست بزرگ شاہ سید قلندر کی کرامات کا تذکرہ ہے۔ جس کے ضمن میں ارشاد ہے

بہت سی کرامتیں ان قلندر صاحب کی ہیں مگر ایک چھوٹی سی کرامت درج ذیل کی جاتی ہے
ایک دن ایک عورت شاہ سیدولی کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگی کہ جناب میرے ہاں کوئی بال بچہ نہیں ہے دعا فرمایئے کہ خدا تعالیٰ مجھ کو لڑکا عطا فرمائے۔ آپ نے نظر باطن سے دیکھ کر فرمایا کہ تیری قسمت میں کوئی بچہ لکھا ہوا نہیں ہے۔ وہ بہت دلگیر ہوئی اور پھر عرض کی۔ مگر پھر بھی وہی جواب ملا۔ آخر وہ عورت مایوس ہوکر واپس چلی گئی۔ اور جب وہ چوک کنک منڈی میں پہونچی تو ایک ولی اللہ نور شاہ گدیلہ نامی جن کا مزار اب بھی اسی جگہ بازار کی دکانوں میں موجود ہے اس عورت کو ملے اس نے ان کی خدمت میں حصول اولاد کیلئے التجائے دعا کی۔ نور شاہ نے کہا خاطر جمع رکھ خدا تجھ کو لڑکا دے گا۔ بس وہ اپنے گھر چلی گئی اور خدا نے اسے پورے دنوں پر لڑکا عطا فرمایا۔ وہ عورت حیران تھی کہ شاہ سید کی بات کبھی خطا نہیں گئی۔ ان کا کہا پورا ہوجاتا ہے اور میری بابت آپ نے کہا تھا کہ تمہاری قسمت میں کوئی اولاد نہیں ہے تو پھر یہ لڑکا میرے ہاں کیسے پیدا ہوا۔ بس وہ عورت لڑکے کو لے کر شاہ سید کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ان سے کہا کہ آپ تو کہتے تھے تمہاری قسمت میں کوئی اولاد نہیں دیکھو خدا نے مجھ کو یہ لڑکا عطا فرمایا۔ آپ نے پھر نگاہ لوح محفوظ کی طرف کی اور دیکھا تو وہاں کچھ بھی لکھا ہوا نہ پایا اور اس عورت سے

کہا کہ تیری قسمت میں تو لوح محفوظ پر لکھا ہوا کہیں نظر نہیں آتا یہ لڑکا تمہارے ہاں کیسے ہوگیا۔
عورت نے جواب دیا کہ جس روز میں آپ کے پاس اسی مطلب کے لئے آئی تھی اور مایوس
ہوکر واپس چلی گئی اور سیدھی نور شاہ کے ہاں پہنچی تو ان سے اولاد کے لئے عرض کی تو انھوں نے
کہا کہ جاؤ خدا تم کو لڑکا دیگا۔ بس ویسے ہی ہوا اور خدا نے مجھ کو پورے دنوں پر یہ لڑکا عطا فرمایا ہے
شاہ سید نے جب نور شاہ کی طرف نگاہ کی تو ان کی زبان پر لکھا ہوا پایا۔ تب شاہ سید نے کہا بیشک
درست ہے۔ اگر نور شاہ نہ کہتا تو کبھی لڑکا پیدا نہ ہوتا۔ کیونکہ خدا نے نور شاہ کی زبان پر لکھا ہوا تھا
تو ثابت ہوا کہ فقیروں کی زبان بھی لوح محفوظ ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ فقیروں کی زبان پر لکھ دیتا
ہے۔ وہ جیسا فرمائیں ویسا ہو جاتا ہے۔ پس بطور مذاق شاہ سید صاحب نے عورت سے کہا کہ یہ
تو لڑکی ہے تو کہتی تھی کہ یہ لڑکا ہے۔ جب عورت نے دیکھا تو وہ لڑکی نظر آئی۔ حیران ہوئی۔ کہ
میں تو گھر سے لڑکا لے کر آئی تھی۔ یہ لڑکی کیسے ہوگئی۔ پس وہ عورت لڑکی کو لے کر نور شاہ صاحب
کی خدمت میں پہنچی اور ان سے سب حال سُنایا کہ آپ کی دُعا سے خدا نے مجھ کو لڑکا عطا فرمایا۔
اور شاہ سید کہتے تھے کہ تمہاری قسمت میں اولاد ہی نہیں ہے اور میں ان کو دکھلانے گئی تھی۔ کہ
آپ تو کہتے تھے کہ تمہاری قسمت میں اولاد ہی نہیں ہے اور نور شاہ کے کہنے پر مجھ کو خدا نے لڑکا عطا
فرمایا ہے۔ تو آپ نے یہ سن کر کہا کہ یہ لڑکا نہیں لڑکی ہے تو ان کے کہنے سے یہ لڑکی ہوگئی ہے اس
پر نور شاہ صاحب مسکرائے اور کہا کہ نہیں مائی لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہے۔ غور سے دیکھ جب
جب عورت نے دیکھا تو لڑکا ہی نظر آیا۔ وہ پھر شاہ سید کے پاس گئی اور کہا دیکھو شاہ صاحب یہ
لڑکا ہے۔ لڑکی نہیں۔ اس پر شاہ سید صاحب نے کہا کہ اے عورت تم غلطی کرتی ہو یہ تو لڑکی ہے
لڑکا کہاں ہے۔ جب پھر عورت نے دیکھا تو وہ لڑکی ہوگئی۔ پس وہ اسی وقت پھر نور شاہ صاحب
کی خدمت میں پہنچی اور کہا کہ جناب یہ تو پھر لڑکی ہوگئی ہے۔ جس پر نور شاہ صاحب نے کہا کہ یہ تو
پاگل ہے دیکھ یہ تو لڑکا ہے۔ ان کے کہنے پر پھر جب عورت نے دیکھا تو لڑکا ہی پایا۔ تب عورت
نے کہا کہ میں کیا کروں جب آپ کے پاس آتی ہوں تو لڑکا ہو جاتا ہے اور جب شاہ سید کے

ہاں جاتی ہوں لڑکی ہو جاتی ہے۔ اس پر نور شاہ صاحب نے کہا کہ اب شاہ سید کے پاس
نہ جانا اور سیدھی اپنے گھر کو چلی جانا تو پھر لڑکا ہی رہے گا۔ اے عزیز! دیکھا کہ خدا کے بندے
ایک نظر میں کچھ کا کچھ کر کے دکھا دیتے ہیں۔"

غور فرمایا آپ نے کہ یہ اہلِ شریعت اور اہلِ طریقت۔ یہ اہلِ حال اور اہلِ قال یہ ارکینِ دینِ مبین
اور عالمانِ شرعِ متین کس کس قسم کے مہمات امور کی سرکردگی میں مصروف ہیں۔ اسپر بھی آپ کو تعجب ہے
کہ مسلمان دن بدن ذلیل تر کیوں ہوتا چلا جا رہا ہے۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھکو ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

(اقبالؒ)

جذبۂ مرعوبیت جس قوم کا مزاج غلامی میں پختہ ہو جائے۔ اس میں جذبۂ مرعوبیت بہت زیادہ گھر کر جاتا ہے۔ اور وہ قومِ غالب کی خوشنودیٔ مزاج کی خاطر وہ حرکتیں کرتا ہے۔ جسے دیکھ کر عقل شرمائے۔ اور خودداری ماتم کرے۔ ہندی مسلمان نے تقلیدِ افرنگ میں جو کچھ کیا وہ اس کی خوئے غلامی کی محکم سند تھا۔ اب طاقت ہندوؤں کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہی ہے۔ اس لئے وہ انھیں خوش کرنے کے لئے وہ کچھ۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ کر رہا ہے۔ ہندوؤں نے یہ چاہا کہ "ملک کی مشترکہ زبان" سے فارسی۔ عربی کے کافرانہ الفاظ نکال کر ان کی جگہ ہندی بھاشا کے لیوتر شبد داخل کئے جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اس ہم کا اشارہ کیا۔ اور اشارہ پر ناچنے والوں نے وہ کچھ کر دکھایا۔ جو خود ہندوؤں کے بھی ذہن میں نہ تھا۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ سطحی قسم کے مزاحیہ افسانوں میں اچھا نام پیدا کر چکے ہیں۔ وہ صاف اور سلیس اردو لکھتے ہیں۔ اور ان کی کتابوں میں بے جا ہندی الفاظ کی ٹھونس ٹھانس کہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن انہی میرزا صاحب کا ایک خط کلکتہ کے ہندی ماہنامہ "وشال بھارت" میں شائع ہوا ہے۔ اس کی زبان ملاحظہ فرمایئے لکھتے ہیں:-

"آپ کے کارڈ کے لئے دھنیاباد۔ میں اپنی کٹھنائیاں بتا نہیں سکتا۔ مجھے خوشی ہے کہ زمانہ"

کا میرا لیکھ آپ کو پسند ہوا، اردو سے میرا ذہنیش انوراگ ہے پر اس کو میں وہ ستھان نہیں دے سکتا جس کے لئے وہ ادھیکاری نہیں ہے۔ ہندوستان بھر کے لئے تو ہندی ہی اپ یکت ہے۔ ہندی کتنی سرل ہے۔ اردو والوں کو ہندی راشٹر بھاشا بنانی چاہئے۔ اور اردو اپنے مذہب کی بھاشا۔ لیکن ہندی والے اردو والوں میں ہندی پرچار کے لئے کچھ نہیں کر رہا ہے میں نے ایسا کرنے کا نشچے کر لیا ہے اور اردو والوں میں سے مہان بھوگی والے اکٹھے بھی کئے ہیں۔ جو "انجمن اشاعت ہندی" کو چلانے جا رہے ہیں۔ تاکہ اردو والوں میں ہندی کا پرچار ہو۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ ہے کہ انھوں نے ہندی اردو کی پہلی دو پرائمریں نکالی ہیں جن کو میں آپ کے پاس بھیج رہا ہوں"

ونیت ہیتی بھائی

عظیم بیگ چغتائی

یہ مسلمان صاحب ہیں۔ اسی رسالہ میں ان کے خط کے ساتھ سوامی بابو وشوناتھ پرشاد کا بھی ایک خط شائع ہوا ہے۔ اس کی زبان بھی ملاحظ فرمایئے۔ لکھتے ہیں۔

" کتاب کے نام نے لڑکپن کی یاد تازہ کر دی۔ کوئی بیس برس کا زمانہ ہوا ہوگا کہ میں اسکول میں پڑھتا تھا اور میرے فارسی اردو کے استاد مولوی محمد حسین فائز ہیڈ مولوی تھے۔ وے بنارس کے اپنی زندگی تک کے سب سے مشہور شاعر سمجھے جاتے تھے۔ شہر کے ایک مشہور رئیس کے باغ میں مشاعرہ تھا۔ فائز صاحب بیماری کی وجہ سے خود نہ آ سکے مگر ایک شاگرد کے ذریعہ اپنی غزل بھیج دی تھی۔ رواج کے مطابق غزل مشاعرے کے خاتمے پر اخیر میں پڑھی گئی۔ آپ کی کتاب کے نام نے ان کی اس غزل کا مطلع یعنی پہلا شعر یاد کرا دیا۔

چوڑیوں کا شور سنیئے منہ کڑوں کا دیکھئے
آپ کے زیور بھی ہیں اے جان ہنستے بولتے

آپکی کتاب "بولتی پراتا" اسم بامسمٰی ہے ...."

دیکھا آپ نے! غلام ذہنیت کا مسلمان۔ ہونے والے ہندو آقا کی خوشنودی مزاج کے لئے اس

مقام تک جا پہونچا ہے۔جہاں ابھی خود ہندو بھی نہیں پہونچا۔

دین و دانش را غلام ارزاں دھند　　　تابدن را زندہ دارد جان دھند

مکمل مذہب سابقہ اشاعت کے "حقائق وعبر" میں ایک کمیٹی کا ذکر کیا گیا تھا۔ جو اس غرض کے لئے متعین کی گئی ہے کہ ہندوؤں کے قانونِ وراثت میں ترمیم و تنسیخ کرے۔اس کمیٹی نے بہت سے سوالات مختلف ہندو ارباب حل وعقد کے پاس بھیجے تھے۔جن میں دریافت کیا گیا تھا کہ اس قانون کے کون کون سے گوشے ان کے نزدیک قابلِ اصلاح و ترمیم ہیں۔ان سوالات کے جوابات کا مفہوم کیا ہے ؟ یہ اس خبر سے ملاحظہ فرمائیے جو ہندوستان ٹائمز بابت ۳۱ میں ان الفاظ میں شایع ہوئی ہے۔

ہندو لا رکمیٹی نے جو استفسارات شایع کئے تھے ان کے جواب میں اکثریت کی رائے یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہندوؤں کے قوانین کی۔یہاں اور وہاں سے تھوڑی بہت ترمیم کی جائے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام و کمال ضابطۂ قوانین میں ترمیم و اصلاح کی جائے۔چنانچہ اُمید کی جاتی ہے کہ اب یہ کمیٹی حکومت سے درخواست کرے گی کہ ان کے حدود تحقیقات میں بایں انداز توسیع کردی جائے کہ وہ تمام ہندو قانون کی جانچ پڑتال کرکے ایسی ترمیم و تبدل کی تجاویز پیش کریں"۔

ہر اس قانون کا یہی حشر ہوگا۔جس کی بنیادیں فطرتِ انسانی کے مقتضیات پر نہ ہونگی۔خدا کے بنائے ہوئے اور انسانوں کے وضع کردہ قانون میں آنا ہی تو فرق ہے۔

گروہِ منافقین کسی قوم میں گروہ منافقین سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔یوں تو ایسے لوگوں کی کہیں بھی کمی نہیں۔لیکن ہندی مسلمانوں میں یہ بہت اکثریت سے پائے جاتے ہیں جس کی وجہ ان کی خودی کا ضعف ہے۔اس حقیقت کو مسٹر جناح نے لگلے دنوں اپنی ایک تقریر میں بے نقاب کیا جب انھوں نے فرمایا۔

" ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے ممالک میں بھی ایسی باتیں واقع ہوتی رہتی ہیں۔لیکن میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی بھرمار ہے۔جن کا ایک پاؤں ایک کشتی میں۔اور

دوسر دوسری کشتی میں رہتا ہے اور وہ ہمیشہ حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں ایسے لوگوں سے ہمیشہ ہوشیار رہو جب تمہیں اس نہج کی تعلیم و تربیت اور تجربہ حاصل ہو جائے جس سے تم اس قابل ہو جاؤ کہ اپنے لئے صحیح قسم کا لیڈر منتخب کر سکو۔ تو سمجھ لو کہ تمہاری آدھی مہم سر ہو گئی۔ (اسٹیٹسمین مورخہ ۱۰)

ہمارا خیال ہے کہ اتنے عرصہ کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اب مسلمان میں یہ صلاحیت پیدا ہوتی جا رہی ہے جس سے وہ اصل لیڈر اور "جاپانی لیڈر" میں تمیز کر سکے۔

نقاب اُٹھ جانے کے بعد سابقہ اشاعت میں ہم نے فسادات ڈھاکہ اور احمد آباد کے سلسلہ میں لکھا تھا۔ کہ گاندھی جی نے کس طرح بلا تحقیق و تفتیش ان فسادات کی ساری ذمہ داری "مسلمان غنڈوں" کے سر تھوپ دی ہے۔ پرچہ پریس میں جا چکا تھا کہ گاندھی جی کا ایک خط اخبارات میں شائع ہوا۔ جس نے ان کی مہاتمائیت کے نقاب کی آخری دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ گاندھی جی نے یہ خط فسادِ احمد آباد کے سلسلہ میں مسٹر مہادیو ڈیسائی کے ہاتھوں۔ گجرات پراونشل کانگریس کمیٹی کے نام بھجا ہے۔ سنئے کہ یہ اہمسا کے اوتار ہندوؤں کو کیا سبق پڑھا رہے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اگر کانگریسیوں کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ کسی حملہ آور کے خلاف تشدد برتنا فرض ہے اور اسے کانگریس کے نصب العین کے خلاف خیال نہیں کرتے تو انہیں چاہئے کہ اپنے اس خیال کا واضح طور پر اظہار کر دیں اور لوگوں کی اس کے مطابق راہ نمائی کریں۔ اس نازک موقع میں ہمارے لیڈروں کا جیل میں ہونا اس بات سے مانع نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اپنے اس خیال کا اعلان کر دیں۔ اگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خیال غلط تھا تو اسے تبدیل کر لیا جا سکتا ہے ...... مجھے یقین ہے کہ اگر تمام کانگریسیوں نے اپنے فریضہ کی ادائیگی کر دی ہوتی تو وہ غنڈہ شاہی قائم نہ ہوتی جو پچھلے دنوں سے قائم ہو رہی ہے۔ یہ چیز کہ لوگ غنڈوں کے خیال سے بھاگ نکلتے ہیں ناقابلِ برداشت ہے۔ ان میں یہ قوت ہونی چاہئے کہ وہ ان غنڈوں کا تشدد یا عدم تشدد سے مقابلہ کریں۔ ....

ہمیں لوگوں کو صاف صاف بتا دینا چاہئے کہ یوں بھاگ نکلنا انتہائی بزدلی ہے۔ ان کا فرض ہے

اگر ہم تشدد سے مقابلہ نہیں کر سکتے (جو بہتر طریقہ ہے) تو تشدد ہی سے ان غنڈوں کا مقابلہ کریں۔ آگے چلکر گاندھی جی لکھتے ہیں کہ اپنی حفاظت کے لئے چوکیدار ملازم رکھ لینا۔ یہ بھی بزدلی ہے.....

متوسط درجے کے تاجر پیشہ نوجوانوں میں کوئی ایسا نہیں ہونا چاہئے جو اپنی حفاظت کے لئے ٹریننگ نہ حاصل کرے۔ خواہ یہ عدم تشدد کی ہو یا تشدد کی اس قسم کے چوکیدار رکھ لینا تو غنڈہ شاہی کے قیام میں اور بھی مد ہوگا۔"

چنانچہ اس غرض کیلئے گاندھی جی نے کانگرسیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو اس قسم کے غنڈہ شاہی کو ختم کرے۔ اور اس کمیٹی میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ سب ہندو ہی ہندو ہیں۔

گاندھی جی کی اس چھٹی کو غور سے پڑھئے اور پھر سوچئے کہ ہوا کا رُخ کدھر کو ہے۔ اس خط میں تین چار مرتبہ مسلمانوں کو غنڈہ کہا گیا ہے۔ اور ہندوؤں کو بار بار تلقین کی جا رہی ہے کہ وہ بیشک تشدد پر بھی اتر آئیں اور قوم کے نوجوانوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اس قسم کے تشدد کے لئے ہر وقت تیار رہیں اور اس کی ٹریننگ حاصل کریں۔ یہ وہ اہنسا کے اوتار ہیں جو سرحد کے پٹھانوں کو عدم تشدد سکھلانے جاتے ہیں۔ جو کل ہی انگریزوں سے کہہ رہے تھے کہ تشدد سے اپنی حفاظت کرنیسے گھر بار لٹا دینا بہتر ہے وہ آج کانگرسیوں سے کہہ رہے ہیں کہ لیڈروں کے جیل سے آنے کا بھی انتظار نہ کرو۔ اور اگر تم چاہتے ہو تو لوگوں کو تشدد کی تلقین کرو۔ ضرورت ہوئی تو بعد میں اس روش کو بدل لیا جائے گا۔

سابقہ اشاعت ہی میں ہم نے فساد بہار کے متعلق بھی لکھا تھا کہ اس بارے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دیگر کانگریسی لیڈروں کی تحقیقات کے کیا نتائج ہیں۔ اور انھوں نے کسطرح ان مظالم کا ذکر کیا ہے۔ جو ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر توڑے گئے۔ اس فساد اور ڈاکٹر صاحب کے اس بیان پر گاندہی جی نے ہندوؤں کے خلاف یا مظلوم مسلمانوں کی ہمدردی میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ انھوں نے ایک عامیانہ سا بیان

شائع کیا جس سے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کسے مجرم قرار دے رہے ہیں۔ اس فساد کے سلسلے میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے اخبار النقیب (بابت ۵ رجمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ) کا حسب ذیل تبصرہ۔ قومیت پرست حضرات کی آنکھوں سے شاید مصلحت بینی کی کوئی پٹی کھول سکے وہ اخبار اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں رقمطراز ہے:۔

"کانگریس مدعی ہے کہ وہ ملک کی مشترکہ انجمن ہے اسکے سامنے ملک کا مشترکہ مفاد و مشترکہ فلاح و بہبود ہے اور ہندوستان کی امنیت اور رتا ہیت ہے ایک حد تک جہانتک نصب العین کا تعلق ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کانگریس ہی ملک کی ایسی جماعت ہے جسکو ہندوستان کے ہر گروہ اور جماعت کی نمائندگی کا حق حاصل ہے لیکن یہ بھی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ تحریک خلافت کے بعد اس زمانہ سے جبکہ شدھی اور سنگھٹن کے غلط جذبات کے سیلاب میں ہندو دنیا بہنے لگی۔ اور ملک میں فتنہ و فساد کی تخم ریزی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس کے برگ و بار نکلے اور اسکے تلخ ثمرات سے اچھے اچھے بھلے مانس لوگوں کے کام و دہن کی بھی لذت بگڑنے لگی اُنکے چہرہ زہر در شتی۔ انکے مزاج میں خون آشامی اور اُن کے ارادہ و کردار میں جنگ جوئی۔ منافرت غلط عصبیت کے آثار بے محابا نمایاں ہونے لگے اور ملک فتنہ و فساد کا آماجگاہ بن گیا۔ ہندو مہاسبھا اور راشٹریت کی دوسری جماعتوں نے ملک کو غلط راہ پر لگانے میں اقدامات کئے اور کھلم کھلا اعلان اشتہار۔ تجویز و تقریر سے کام لینا شروع کیا۔ کانگریس ان سب چیزوں کو آنکھ کھول کر دیکھتی رہی۔ اور اس کے لئے کوئی ایسا عملی اقدام نہیں کیا جو ملک کو اس غلط راہ پر لگنے سے روکتا۔ حالانکہ وقت کا سب سے اہم فریضہ اس وقت کانگریس کا یہی تھا۔ کہ پوری طاقت سے میدان میں اترتی اور اس کا انسداد کرتی۔ اور صلح و آشتی۔ امن اور شانتی کا پیامبر بن کر نکلتی اور اس راہ میں وہ سب کچھ کرتی۔ جو ملک کی مشترکہ انجمن کے مشترکہ مفاد اور مشترکہ فلاح و بہبود کا اقتضا۔ تھا۔ مگر افسوس اُس نے یکسر اس سے بے اعتنائی برتی۔ اور محض بے اعتنائی نہیں بلکہ مجرمانہ غفلت سے کام لیا۔

تاآنکہ ملک کا مزاج آج اس درجہ خون آشام ہو گیا۔ جس پر آپ بہ سہولت قابو پا لینا

حکومت اور کانگریس دونوں کے بس سے باہر ہے۔

مجھکو یاد ہے کہ پردلیا میں جب پولیٹیکل کانفرنس ہوئی تھی۔جس کے صدر شاہ محمد زبیر صاحب مونگیری مرحوم تھے۔ اور گاندھی جی بھی موجود تھے۔اسی زمانہ میں امارت شرعیہ کا وفد بھی پردلیا گیا تھا اور میں بھی اسمیں شریک تھا حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے گاندھی جی سے ملک کی ناخوشگوار فضا پر گفتگو کے لئے وقت حاصل کیا تھا۔جسمیں گاندھی جی، شاہ محمد زبیر، حضرت نائب امیر شریعت، مولانا عبدالصمد رحمانی اور ایک دو شخص اور بھی شریک تھے۔حضرت مولانا مرحوم نے گاندھی جی کے سامنے ملک کی ناخوشگوار فضا کی اصلاح و درستگی کیلئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ قوم پرور ہندو اور قوم پرور مسلمان جو فتنہ و فساد کو ملک کیلئے بربادی اور تباہی سمجھتے ہیں وہ متفقہ طور پر فتنہ و فساد کے متعلق ملامت کا اظہار کریں۔ اور ان لوگوں کے متعلق جو اس فتنہ و فساد کی آگ کو سلگاتے ہیں اور مشتعل کرتے ہیں نام بنام متفقہ طور پر یہ اعلان کریں کہ یہ لوگ ملک کے دشمن اور بدخواہ ہیں اور اسمیں کسی شخص کی کوئی رعایت نہ کی جائے۔چاہے ہندو ہو یا مسلمان ہو۔اور تمام ملک میں جلسہ جلوس، اشتہار، پوسٹر۔تجویز و تقریر سے صلح و آشتی کی تبلیغ کی جائے۔ اور فسادی عنصر کے اثرات کو یکسر پاک کر دیا جائے۔مگر افسوس گاندھی جی نے اس وقت مایوسی کے پیکر بن کر بجز اس کے اور کچھ نہیں کہا کہ میرے نزدیک اس وقت ملک اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور اس کا خاطر خواہ فائدہ نہ ہوگا حالانکہ وہی وقت تھا جو اس کے انسداد کا صحیح وقت تھا۔ اور یہ فتنہ بڑے بڑے شہروں سے نکل کر گاؤں تک نہیں پہنچا تھا۔اور ملک کی اکثریت اس زہر سے مسموم نہیں ہوئی تھی"۔

ہم نہیں سمجھ سکتے (اور ان قومیت پرست حضرات کے سوا اور سمجھ بھی کون سکتا ہے) کہ جب کانگریس کی یہ حالت ہے تو پھر یہ کوشش کہ ملک کی حکومت کانگریس کے ہاتھ میں چلی جائے۔کس

طرح سے اسلام دوستی پر مبنی خیال کی جاسکتی ہے؟

کانگرسی حکومت کا ذکر آگیا تو ہمیں جناب احمد سعید صاحب (نائب صدر جمعیت العلماء ہند) کا وہ خطبۂ صدارت یاد آگیا جو انھوں نے اپریل گزشتہ میں بجنور کے جلسۂ جمعیۃ العلماء میں ارشاد فرمایا تھا جس کے دوران میں آپ نے فرمایا۔

"کانگریس کی بے پناہ طاقت اور انتخابی قوت نے کانگریس کو آٹھ صوبوں میں حکومت کا موقع دیا۔ کانگریسی حکومتوں کیلئے یہ بہترین موقع تھا۔ کہ وہ "انڈین نیشنل کانگریس" کی محبت کو لوگوں کے قلوب میں بڑھاتیں۔ اور اقلیتوں کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرتیں .... کانگریسی حکومتوں کو قدرت کے اس زریں موقع سے فائدہ حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن ہوا کیا؟ — وہی ہوا جو سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑ جانے سے ہوا کرتا ہے۔ کم ظرفی اور تعصب کا وہ مظاہرہ کیا گیا کہ دشمن تو دشمن دوست بھی پریشان ہو گئے۔ حکومت ملنے کے بعد بھی ترازو ہاتھ سے نہ گئی۔ جو چیز دی گئی تول تول کر اور ناپ ناپ کر دی گئی۔ خیر اس کا بھی مضائقہ نہ تھا تول کر ہی دیا جاتا۔ لیکن پورا تو تولا جاتا، وزیر بن گئے۔ لیکن ڈنڈی مارنے کی عادت نہ گئی۔ ہندو مسلمانوں کو دو مختلف آنکھوں سے دیکھا گیا۔"

ذرا غور فرمایئے۔ کانگرسی وزراء کے مستعفی ہونے پر لیگ کی طرف سے "یوم نجات" منایا گیا تو وہ حرف بہ حرف انھی جذبات کی بنا پر تھا۔ جو جناب صدر صاحب جمعیۃ العلماء کی طرف سے اب ظاہر کئے گئے ہیں۔ اس وقت ان تمام حضرات نے لیگ کی مخالفت کی اور ملک کے طول و عرض میں اس کے خلاف مظاہرے کئے۔ اور جلسے منعقد کئے گئے۔ جن میں مسلمانوں کو یہ چیلنج دیا گیا کہ وہ کانگریسی حکومت کی کوئی بدعنوانی ثابت کرے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب جناب احمد سعید صاحب (یا دیگر ارباب جمعیت) کے علم میں تھا۔ کہ کانگریس نے اپنے دور حکومت میں مسلمانوں کیساتھ اس قسم کی بے انصافی کی ہے تو کیا دیانت کا تقاضا نہ تھا کہ جب لیگ نے اس حکومت کی مخالفت کی

تھی تو اربابِ جمعیت بالعموم اور جناب احمد سعید صاحب بالخصوص کم از کم اس ایک باب میں لیگ کی ہمنوائی کرتے؟ غور فرمائیے! یہ وہ لوگ ہیں جو دیانت اور تقویٰ میں اپنی امامت کے مدعی ہیں۔ یہ ہے پارٹی بازی کی وہ لعنت جو انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی؟

لیکن جو کچھ ہوا اسے چھوڑیئے۔ سوال یہ ہے کہ اب جوان قومیت پرست حضرات کے علم میں آگیا کہ جب زمامِ حکومت "کانگریس" کے ہاتھ میں جاتی ہے تو مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کی ناانصافی ہوتی ہے۔ تو اس کے بعد یہ دعویٰ کہ کانگریس ہندو مسلمان دونوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اور آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ حکومت کانگریس کی ہو کیں اصول پر حق بجانب ہے۔ اور لیگ کا یہ مطالبہ کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں میں خود مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیئے۔ جو قوانینِ شریعت کو نافذ کرے کیوں ناقابلِ قبول ہے۔؟

کیا بارگاہِ علم و تقویٰ سے اس کا کوئی خاطر خواہ جواب مل سکتا ہے؟

ایمان بلا عمل

(جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز)

قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں بھی اپنے اندر عجیب سامانِ موعظت رکھتی ہیں۔ ان کے بڑہنے اور ابھرنے کے زمانہ کو دیکھئے۔ نصب العین کی صداقت پر یقین محکم (ایمان) اور اس کے حصول کی خاطر تگ ودوِ مسلسل (عمل) زندگی کی ساری کہانی دو لفظوں میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ دلوں میں ولولے خون میں حرارت آنکھوں میں چمک۔ سارا ماحول زندگی سے بھرپور۔ خاک کے ایک ایک ذرہ میں نویدِ حیات درخشندہ۔ مصائب میں مسرت۔ مشکلات میں راحت۔ موت میں حیات کے سامان خوابیدہ۔ فتح و ظفر سندری باؤں چومتی۔ سعادت وکامران رکاب تھامتی۔ اللہ کی نصرت کے فرشتے جلو میں۔ منزل کی تابناکی شمع راہ۔ دل یقین کی دولت سے معمور۔ قدم لذتِ جادہ پیمائی سے محوخرام۔ غرضیکہ تمام عمر دریا کی طرح ایک مسلسل روانی۔ غیر منقطع جدوجہد۔ یعنی ایمان وعمل کی زندہ تفسیر۔ یہ تھی مسلمان کے دورِ عروج کی ابتدا۔ نبی اکرمؐ سے عرض کیا گیا کہ مسلمان کی زندگی کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ جب جہاد ہورہا ہو تو اس میں شریک ہو اور جب نہ ہورہا ہو تو اس کی تیاری میں مشغول ہو۔ سارا فلسفۂ حیات ایک جملہ میں مرکوز۔ یہ سپاہیانہ دور سابقون بالخیرات (۳۵/۳۲) کا تھا یعنی حسنِ عمل میں آگے بڑہنے والوں کا دور اس کے بعد ایک درمیانی دور (مقتصدین) کا آیا۔ جو کچھ بزرگوں کے ترکہ میں ملا۔ اسے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ مجاہدانہ اعمالِ حیات کی طغیانیاں، درباری تکلفات کی بزم خیزیوں میں بدل گئیں۔ دینِ خداوندی کے نظامِ فطرت کو تمام انسانی ضوابطِ زندگی (ادیانِ عالم) پر عملاً غالب دیکھنے کی بجائے نظری مباحث اور منطقیانہ دلائل سے اس کی فوقیت و برتری ثابت کرنے کو ہی مقصدِ حیات سمجھ لیا۔ قوانینِ خداوندی جن کی تفسیر اعمالِ زندگی سے ہوتی تھی۔ حروف و نقوش کے پیکروں میں سجا کر رکھ دیئے گئے۔ رفتہ رفتہ قوائے عملیہ مفلوج ہوتے گئے۔ ہمتیں پست ہوگئیں۔ ولولے سرد پڑ گئے۔

بایں ہمہ اس دور میں بھی کہیں کہیں برسے ہوئے بادلوں میں بجلی کی چمک اور جلے ہوئے نیستاں میں تبسّم شرار نظر آتا رہا۔ اس کے بعد تیسرا دور (ظالین) کا آیا۔ دورِ عمل پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ ایمان کے متعلق انہیں اسلاف سے کتابوں کے ذخائر ملے جو نظری مسائل کے پیچ در پیچ مباحث سے بھری پڑی تھیں اب ان کے نزدیک مقصد حیات، چند الفاظ کو ایک خاص طریق سے دہرا لینے کا نام رہ گیا — اور اعمال؟ چند رسوم کی میکانکی انداز سے ادائیگی۔! حالانکہ ایمان سے مفہوم تھا۔ اللہ تعالیٰ کے متعین فرمودہ نصب العین کی صداقت و فوقیت پر غیر متزلزل یقین۔ اور اعمال سے مقصد اس نصب العین کے حصول کی تڑپ۔ عبادات اس تڑپ کے مظاہرے تھے جنھیں اسوۂ نبی اکرم نے عدیم النظیر محسوس پیکر عطا کر دیئے تھے لیکن اس آخری دور میں سارا دین سمٹ سمٹا کر چند الفاظ کی ادائیگی کا نام رہ گیا۔ اور چونکہ ضابطۂ خداوندی میں نجات و سعادت ایمان سے مشروط تھی۔ اس لئے سمجھ لیا گیا کہ جو شخص ایک خاص انداز سے چند خاص الفاظ کو دہرا دیگا اُس کی کامرانیوں اور شادمانیوں کا اللہ ذمہ دار ہو جائے گا۔ کہ ایمان کے صدقے میں سعادت و نصرت کا عطا ہونا فرمودۂ خداوندی ہے۔ اس کے بعد یہ بحثیں چھڑیں کہ کیا اعمال کے بغیر خالی ایمان سے بھی نجات ہو سکتی ہے یا نہیں؟ حالانکہ اگر ایمان اور اعمال کا صحیح اسلامی مفہوم سامنے ہو تو اس بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ایمان وہ جذبۂ صادقہ ہے جو اعمال کا محرک ہوتا ہے۔ یہ وہ بیج ہے جس سے شجرِ حیات شاخِ طوبیٰ کی طرح بڑھتا۔ پھولتا۔ اور پھلتا ہے۔ اس لئے جس بیج سے درخت پیدا نہیں ہوتا۔ وہ بیج ناقص ہے۔

مردہ آں ایمان کہ ناید در عمل

قرآن کریم کی رُو سے جس طرح وہ اعمالِ زندگی جن کا محرک ایمان نہیں۔ ایسی بجلیاں بن جاتی ہیں جو انسانیت کے امن و سلامتی کے خرمنوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیتی ہیں۔ اس طرح وہ ایمان جو خالی الفاظ کا مجموعہ سمجھ لیا جائے اور جسکی تصدیق اعمالِ حیات نہ کریں۔ برف کا ایسا تودہ بن جاتا ہے جو رگوں میں دوڑنے والے خون گرم کے ہر قطرہ کو منجمد کر کے رکھدیتا ہے۔ اس لئے فلاح و سعادت اس قسم کے ایمان سے کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ بدبختی سے آج مسلمانوں میں ایک گروہ تو ایسا پیدا ہو گیا

جس نے اسلام میں ایک جدید برہمو سماج کی عمارت لاکر کھڑی کر دی۔ اور خیال باطل پھیلانا شروع کر دیا۔ کہ اصل مقصد عمل ہے۔ ایمان کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خیال ایسی کھلی ہوئی گمراہی پر مبنی تھا کہ اس کی تغلیط اور تکذیب کے لئے کچھ زیادہ سعی و کاوش کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن دوسری طرف صدیوں سے یہ عقیدہ عام مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے کہ تنہا ایمان (یعنی چند الفاظ کا دہرا دینا) نجات کے لئے کافی ہے۔ ان کے نزدیک من قال لا الٰہ الا اللہ فدخل الجنۃ کا مفہوم ہی یہ ہے کہ جس نے ان الفاظ کو زبان سے دہرا دیا۔ جنت کا وارث بن گیا۔ قریب قریب تمام مسلمان کچھ اس قسم کی خوش فہمی میں مگن ہیں۔ اور نہیں سوچتے کہ اس غلط عقیدہ نے کس طرح نقصانِ عظیم پہنچا رکھا ہے۔ آج مسلمانوں پر جس قدر غربت و افلاس طاری ہے۔ محتاجی و بیکسی۔ ذلت و رسوائیوں کے جن عمیق گڑھوں میں یہ قوم گر چکی ہے۔ نکبت و افلاس کی جو ہولناک گھٹائیں ان پر چھائی جا رہی ہیں۔ ہلاکت و بربادی کے جو بے پناہ سیلاب ان کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ذلت و مسکنت کی جو شرربار بجلیاں ان کے خرمنِ حمیت و غیرت، عزت و ناموس کو جلائے جا رہی ہیں۔ اگر ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے تو ان سب کا ذمہ دار یہی غلط عقیدہ ہے۔ جو گھن کی طرح اُن کی جڑوں کو کھوکھلا کر گیا ہے اور ان کو دین و دنیا میں کہیں کا نہیں رہنے دیا۔ بنی اسرائیل کی طرح اُن کا بھی ایمان ہے کہ ہم خدا کے چہیتے بیٹے ہیں۔ یہ بھی اُن کی طرح یہی سمجھتے ہیں کہ جنت ہمارے ہی لئے بنائی گئی ہے۔ خواہ ہم کچھ ہی کیوں نہ کریں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ خدا کی اس مغضوب و معتوب قوم کی طرح یہ بھی ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ کے عذاب الیم میں گرفتار ہے۔ پر نہیں سمجھتی۔ عاد و ثمود کی طرح تدریج بربادیوں اور تباہیوں کے جہنم کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے لیکن نہیں محسوس کرتی۔ قوم لوط اور اصحابِ ایکہ کی طرح ان کی شوکت و عظمت کے تختے اُلٹ چکے ہیں، ان کی تہذیب و تمدن کی فلک بوس عمارتیں کھنڈرات بن چکی ہیں۔ جو ہر صاحبِ بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ فریب خوردہ قوم دل رکھتی ہے اور سمجھتی نہیں۔ آنکھیں رکھتی ہے اور نہیں دیکھتی۔ کان رکھتی ہے مگر نہیں سنتی زمانہ کے تھپیڑے اسے جھنجھوڑتے ہیں لیکن یہ انہیں خواب آور لوریاں سمجھ کر اور گہری نیند میں چلی جا رہی ہے۔ دنیا علم و عمل میں ترقی کرتے کرتے

آسمانوں کو صبو آنیکی ٹھانے بیٹھی ہے لیکن کبھی کبھی چشم باز سے ان کی طرف دیکھتے ہیں اور ایک حقارت آمیز تبسّم سے اتنا کہکر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہاں! اس چند روزہ متاعِ حیات سے فائدہ اٹھالو۔ اس کے بعد دنیا میں بھی ہمیں غالب رہنے والے ہیں اور آخرت تو بالکل ہے ہی ہماری اپنی۔ پھر قیامت یہ ہے۔ کہ یہ عقیدہ کچھ جہلا تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ان کے واعظ اور عالم روز بروز اس عقیدہ کو پختہ ترکرتے چلے جارہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک جیّد مولوی "صاحب اکثر وعظ میں فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانو! کون کہتا ہے کہ گناہ نہ کرو۔ خوب کرو۔ جی بھر کر کرو۔ لیکن ایک درود شریف اوّل اور ایک درود شریف آخر پڑھ لو مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ۔ رحمت کے دو سمندر موجیں مارتے ہوئے ان کو بہا کرلے جائیں گے۔ یہ اس قوم کے "احبار و رہبان" کے مواعظ حسنہ ہیں۔ جن کے خدا کا فیصلہ ہے کہ

مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ

جو ایک ذرہ کے برابر بھی نیکی کریگا وہ اسکی جزا پائیگا۔ اور جو ایک ذرّہ کے برابر بھی برائی کریگا اسکی سزا پائیگا

قرآن کریم کے کسی صفحہ پر نگاہ ڈالیے نجات و سعادت، فلاح و بہبود کے لئے جہاں آمَنُوا آیا ہے اس کے ساتھ ہی عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بھی موجود ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر صرف دوسرے ٹکڑے کو ماننے والے یُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَیَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (قرآن کریم کے ایک حصّے پر ایمان لانے اور دوسرے پر ایمان نہ لانے) کے جرم کے مرتکب قرار دیئے جاتے ہیں تو دوسرے ٹکڑے کو چھوڑ کر صرف پہلے ٹکڑے پر ایمان لانے والے اس جرم سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کا صاف صاف فیصلہ موجود ہے

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○

کیا لوگ یہ گمان کئے بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہدینے سے کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دیئے جائیں گے۔ اور ان پر کوئی آزمائش نہیں ڈالی جائے گی۔

پھر دوسری جگہ ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ جٰھَدُوْا مِنْکُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ
۳:۱۴۱ - پارہ ۱۷:۵

کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ اللہ نے ابھی تک اس بات کو نہیں

آزمایا کہ تم میں سے کون جہاد کرتا ہے اور ثابت قدم ہے۔

کیا آپ نے سورہ توبہ میں نہیں دیکھا کہ جب منافق اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتے تھے تو اُنکے ایمان کی شناخت کے لئے کونسا معیار مقرر کیا گیا تھا۔ فرمایا۔

قُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ

(۹:۱۰۵)

(اے رسول) کہدیجئے کہ ہاں کچھ کرکے دکھاؤ۔ تمہارے اعمال کو خدا اُس کا رسول اور مومنین (خود) دیکھ لیں گے

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ سورۂ انعام میں ہے کہ جب خدا کا عذاب سامنے آجائے گا تو اس وقت نہ تو اس شخص کو نفع پہنچے گا جو اس وقت عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے گا اور نہ ہی اس شخص کو۔

أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا (۶:۱۵۹) جس نے ایمان کے ساتھ نیک عمل نہ کیا ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے زیادہ اور کن واضح الفاظ میں اس حقیقتِ کبریٰ کو بے نقاب کیا جاسکتا تھا۔ یاد رکھیئے جس ایمان کے ساتھ نیک اعمال شامل نہ ہونگے وہ ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے محبوب ہیں۔ اس واسطے کہ ہم ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن جس کے تم محبوب بنتے ہو، وہ تو علانیہ کہہ رہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ وہ تو ایک مسلم کا اس کے اعمال کی وجہ سے دوست ہے۔ نہ کہ اس کے زبانی دعوؤں کی بنا پر۔

وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۶:۱۲۸)

اللہ ان کا دوست ہے بوجہ اُن کے اعمال کے

کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بُرے اعمال کی سزائیں تجویز فرمائی ہیں وہاں مسلم و غیر مسلم۔ مومن و کافر میں کوئی تمیز یا کوئی تفریق بھی کی ہے۔ اس نے صاف صاف کہدیا کہ جہنم سے بچنا۔

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ۔

نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا نہ اہل کتاب کی۔ جو بھی بُرا کام کریگا اس کی سزا پائے گا۔

کسے باشد۔ جو بھی بُرائی کرے گا اس کے جرم اُسے گھیر لیں گے، وہ جہنم میں جائے گا۔ اور وہیں

رہے گا (۲: ۸۱) مثلاً حکم دیا جاتا ہے کہ اے ایمان والو سود نہ کھانا۔ اللہ سے ڈرتے رہنا کہ تم تقویٰ شعار بن سکو۔ لیکن اگر تم اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہو تو۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ

اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ کے ٹکڑے پر نگاہ ڈالئے خطاب یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک سود خوار ایمان کا مدعی ہے اس کے دعویٰ اسلام میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن اس کے جرم کی سزا میں جب اسے جہنم رسید کیا جاتا ہے تو وہ جہنم کوئی الگ نہیں وہی ہے جو کافرین کے لئے تیار کی گئی ہے۔ فرمائیے اس شخص کے دعویٰ ایمان نے اسمیں کیا امتیاز پیدا کر دیا۔ اس سے بھی آگے بڑھئے! بدر کا میدان ہے مسلمانوں کی کل کائنات تین سو تیرہ نفوس، کچھ مہاجرین، کچھ انصار، گھر بار۔ بیوی بچے۔ عزیز و اقارب، مال و دولت، سب کچھ چھوڑ کر ہتھیلیوں پر سر لئے خدا کے راستے میں جان جیسی گراں بہا چیز قربان کر دینے کیلئے تیار ہیں۔ وہ مسلمان ہیں کہ جنکی امداد کے لئے فرشتے بھیجے جاتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں کہ جن کی مغفرت کی بشارتیں اس دنیا میں دی گئی ہیں۔ یہ وہ ایمان والے ہیں جنھیں اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کہا گیا ہے۔ وہ ہیں جن کے ایمان آنیوالوں کے لئے بطور نمونہ کے پیش کئے جاتے ہیں۔ وہ ہیں جن کے متعلق رسولِ خداؐ نے ابھی ابھی دعائیں فرمایا ہے۔ کہ اے اللہ یہ مٹھی بھر جماعت تیری نام لیوا۔ تیرے نام کی حفاظت کے لئے جانیں قربان کرنے کو آن کھڑی ہوئی ہے۔ اگر یہ مٹ گئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔ فرمائیے ان کے ایمان میں شبہ کرنے والے کا خود ٹھکانا کہاں ہے۔ لیکن اسی مقام پر ان کا خدا ان سے کہتا ہے کہ میری مدد برحق۔ لیکن۔

"جو آج کے دن میدان جنگ سے منہ موڑے گا۔ سوائے اس کے کہ وہ لڑائی کے لئے پینترا بدلے یا اپنی جماعت سے ملنے کی خاطر پہلو بدلے۔ تو وہ خدا کے غضب کا مستوجب ہوجائیگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور بُری جگہ ہے رہنے کی" (۸: ۱۶)

زبانی اقرار پر جنت میں جانے کے متمنی ذرا آنکھیں کھول کر اس ارشاد مقدسہ کو دیکھیں۔ جہاد تو عمل کی آخری منزل ہے جو لوگ ایمان لائے تھے لیکن انھوں نے ہجرت نہیں کی تھی ان کے متعلق سُنئے کہ کیا فیصلہ ہے

" اور جو لوگ ایمان لائے لیکن انھوں نے ہجرت نہیں کی۔ تو جبتک یہ لوگ ہجرت نہ کرآئیں

... اُن کے ساتھ (مسلمانوں کا) کوئی دوستانہ واسطہ نہیں ہوگا ..... " (۸:۷۲)

دیکھئے اُن لوگوں کے ایمان کی شہادت تو خدا دے رہا ہے کا نفس وَالَّذِینَ آمَنُوا کہکر پکارا ہے لیکن یہ صرف مدعی ایمان ہیں۔ اصلی مومن سچے ایماندار مُؤْمِنُونَ حَقًّا، تو صرف وہ ہیں

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (۸:۷۴)

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی یہ لوگ اصلی مومن ہیں۔ اُنھی کے لئے مغفرت اور اُنھی کے لئے عزت کا رزق ہے۔

اور جو میدان عمل میں آنے سے ہچکچاتے ہیں، اللہ کا ارشاد ہے کہ اُن کے دلوں پر مہر کردی گئی ہے۔ (۹:۸۷) ان کے برعکس

لَٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۹:۸۸-۸۹)

" لیکن رسول اور وہ لوگ جو اُس کے ساتھ ایمان لائے اور جہاد کیا، اپنے اموال اور جانوں سے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے (سب) خوبیاں اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔ ان کے لئے اللہ نے ایسی جنات تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ انہیں رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے ۔"

دیکھئے سب خوبیاں، کامیابی و کامرانی کی تمام نعمتیں، دُنیا کی سُرخروئی اور عاقبت کے انعام سب انہی کے لئے ہیں جو ایمان کے ساتھ عمل میں پورے اُترتے ہیں۔

پھر یہی نہیں کہ آخرت کی فلاح و بہبود ہی عمل کے ساتھ متعلق ہو۔ اس دنیا کی عزت و وقار کی زندگی خوشحالی و خوش بختی کی زندگی، سرفرازی و سربلندی کی زندگی۔ یعنی وہ زندگی جو فی الحقیقت ایک مومن کی ایک مسلم کی زندگی ہونی چاہیے۔ وہ بھی عمل ہی کے ساتھ مشروط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو مسلمانوں کو دنیا میں جگہ ہی اس لئے دی تھی کہ اُن کے کام دیکھے، نہ زبانی دعویٰ

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۱۰:۱۴)

پھر ہمنے تمہیں دنیا میں حکومت دی پہلی قوموں کے بعد تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اگر تم عمل کی دُنیا میں پورے نہیں اترے تو اُسے تمہارے ایمان کے الفاظ کی کوئی پروا نہیں وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو تمہارا جانشین مقرر کر دیگا۔ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا (۹:۳۹)

اسس لئے کہ جہاں اس کا ارشاد ہے کہ:۔

وَنُودُوا أَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۷:۴۳)

اُن سے پکار کر کہدیا جائے گا کہ یہ جنت ہے۔ جسکے تم اعمال کے باعث وارث قرار دیئے جاتے ہو

وہیں اس دنیا کی جنت کے متعلق بھی اس کا ایسا ہی فیصلہ ہے کہ:۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۴:۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ جو تم میں سے ایمان لائیں اور عمل صالح کریں تو اللہ انکو زمین کی بادشاہت عطا فرمائیگا

پس اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس دنیا میں آپکی ہستی قایم رہے تو ایمان محکم کے ساتھ عمل پیہم بھی پیدا کیجئے کہ یہی سچے مومنوں کی نشانی ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ

یقیناً مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر ان کے ایمان میں ذرا جنبش نہ ہوئی اور ان کی راہ میں اپنے اموال و نفوس سے اُنھوں نے جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔"

ورنہ یاد رکھئے کہ خدا کے فیصلے۔ فطرت کی تعزیریں اٹل ہیں۔ غیر جانبدار ہیں۔ ہر چیز کی بقا عمل سے ہے انسان کا تمام تر سرمایہ عمل ہے۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ خدا ہی کا فیصلہ ہے۔ نتائج عمل سے پیدا ہوتے ہیں اور ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

وہ قول، وہ زبانی دعویٰ، وہ اقرار، وہ اصطلاحی ایمان جس کی تائید اعمال سے نہیں ہوتی جسکی تصدیق آپکے قلوب اور جوارح نہیں کرتے قرآن کی میزان میں ایک پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا۔ نہیں بلکہ ایسا زبانی دعویٰ ایک جرم عظیم ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ

اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہے کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جو کرکے نہ دکھاؤ

اور اگر خدا کے ان کھلے کھلے فیصلوں کے بعد بھی آپ یہی خیال کرتے رہیں کہ چونکہ آپ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں صبح سویرے منہ پر ہاتھ پھیر لے وقت زبان سے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ بھی نکل جاتا ہے اس لئے آپ جنت کے وارث ضرور بن جائیں گے۔ اور ساری دنیا پر غلبہ آپ ہی کا ہو جائیگا اور محض اس لئے ہو جائیگا کہ آپ مسلمان کہلاتے ہیں تو یاد رکھئے کہ یہ سراسر دھوکا ہے۔ فریب ہے، اور یہ فریب خدا کیساتھ نہیں، لوگوں کے ساتھ نہیں بلکہ خود اپنے ساتھ ہے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ۔ لیکن آپ اسکو سمجھتے نہیں ہیں۔ یاد رکھئے دنیا میں آج جہد للبقا (زندہ رہنے کی کشمکش) بڑی سخت ہو گئی ہے۔ قوموں میں باہمی مناقشت ہے۔ مقابلہ کی دوڑ ہے، جو قوم، جو ملک، جو شخص اس دوڑ میں کہیں پاؤں سے کانٹا نکالنے کیلئے ٹھہر گیا۔ فنا ہو گیا۔ ہلاک ہو گیا۔ پیچھے سے آنیوالی قومیں اُسے بے رحمی سے کچلتی ہوئی نکل جائینگی۔ اسی لئے قرآن حکیم نے فرمایا ہے قاعدین (بیٹھنے والے) اور مجاھدین (دوڑنے والے) کبھی برابر نہیں ہو سکتے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قانون آپ پر نافذ نہ ہوگا۔ ارباب قضا و قدر آپ کو اس لئے چھوڑ دیں گے کہ آپ خاص قسم کے نام رکھتے ہیں یا یہ عقیدہ دل میں جمائے بیٹھے ہیں کہ ہمارا زبانی اقرار ہماری فلاح کے لئے کافی ہے۔ فطرت کسی کی سوتیلی ماں نہیں ہے اس نے اگر پہلی قوموں کو فنا کر دیا تو اس لئے کہ ان میں قوت عمل مفقود ہو چکی تھی نہ اس لئے کہ ان سے اسے کوئی ضد تھی۔ اور اب اگر آپ بھی وہی کچھ کریں گے جو ان قوموں نے کیا تو وہ آپ کو اس لئے نہیں چھوڑ دیگی کہ آپ کی کوئی رعایت مقصود ہے۔ اور کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جو قوم اس دنیا میں خدا کے غضب و عتاب سے ہلاک ہو جائے وہ آخرت میں جنت کی مالک ہو جائے گی۔ یہ خدا اور اس کی جنت کے متعلق بڑا غلط اندازہ ہے۔ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ

رومیؒ نطشے اور اقبالؒ

از

جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ریڈر جامعہ عثمانیہ

[" کچھ عرصہ پیشتر تک ' مولانا روم کی مثنوی معنوی اس درجہ مقبولِ عام تھی کہ ہر صاحبِ ذوق کی زبان پر اس کے اشعار اور ہر محفل میں اس کا چرچا سُنائی دیتا تھا۔ تعلیم مغرب کی ترویج کے ساتھ ساتھ ' ہمارے قدیمی نقوش ' آثارِ قدیمہ کی فہرست میں منتقل ہونے شروع ہو گئے۔ اور رفتہ رفتہ مثنوی کی شہرت بھی ماند پڑ گئی۔ لیکن حضرت علامہ اقبال نے اپنے کلام میں پیر رومی کا تذکرہ کچھ اس جذب و شوق سے کیا کہ ان کی یاد ابھر کر سطح پر آ گئی۔ حضرت علامہ کے اس " تعارف " سے نہ صرف مولانا روم کی یاد ہی تازہ ہو گئی بلکہ ان کی تعلیم اور پیغام ایک جدید لباس میں سامنے سامنے آئی جس سے قوم کے نوجوانوں نے ایک نیا اثر قبول کیا۔ اثر تو قبول کیا لیکن حضرت علامہؒ کے پیغام سے مستفیض ہونے والے نوجوانوں میں اکثریت ان کی ہے جو مولانا روم کی تعلیم سے آشنا نہیں ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک مولانا روم کی عقیدت محض حضرت علامہؒ کے تعارف کی بنا پر ہے۔

متاخرین فلاسفہ میں سے حضرت علامہ کے کلام میں۔ جرمنی کے مشہور فلسفی نیطشے کا ذکر بھی متعدد بار آیا ہے۔ لیکن اس کا فلسفہ بھی عام طور پر نگاہوں سے مستور ہے۔

اس لئے پیام اقبال اور اس کے اجمالی اشارات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے منجملہ دیگر امور کے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ مولانا رومؒ کے تعلیم اور نیطشے کے فلسفہ سے کچھ نہ کچھ واقفیت ہو۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے زیر نظر مضمون میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے۔ جسے ہم رسالہ اردو کے شکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ مضمون میں بعض مقامات ایسے ہیں جن کے متعلق تشریحی نوٹ

لکھنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ساتھ نوٹ لکھنے کی بجائے یہ زیادہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ مضمون کے آخر میں چند سطور بطور استدراک لکھ دی جائیں۔ قارئین طلوع اسلام اجمالی[*] مقامات کی تشریح کے لئے اس استدراک کا انتظار فرمائیں جہاں فلسفیانہ مباحث آگئے ہیں، مضمون کچھ خشک سا ہو گیا ہے۔ لیکن مضمون کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ آپ ان مقامات کا دقت نظر سے مطالعہ فرمائیں مضمون بالاقساط شائع ہو سکے گا۔" ——— "طلوع اسلام"]

اکثر بڑے شعرا اور مفکرین کے کلام کا اگر عقلی تجزیہ کیا جائے تو کسی ایک کے کلام میں ایک یا دو سے زیادہ اساسی تصورات نہیں ملتے۔ ہر بڑے آدمی کی خواہ وہ مفکر ہو یا مصلح زندگی کے متعلق ایک نظر ہوتی ہے۔ اس کی ہزاروں باتیں ایک یا دو تصورات سے مشتق ہوتی ہیں۔ کوئی ایک تصور عام طور پر اس کا تصور حیات ہوتا ہے۔ افکار کی فلک بوس تعمیر کسی ایک چٹان پر قائم ہوتی ہے۔ اس کے شجر حکمت کے پھول اور پھل برگ و شاخسار اپنی گوناگونی اور بوقلمونی کے باوجود ایک جڑ سے نکلتے ہیں۔ سمجھنے کے لئے جب تک وہ اصل ہاتھ نہ آئے کسی بڑے مفکر کا کلام اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا۔ بعض اوقات ایک بڑی تصنیف یا ایک بڑا فلسفہ ایک قفل ابجد ہوتا ہے۔ جب تک ان حروف کا علم نہ ہو جو اس کے لئے بطور کلید ہیں وہ قفل نہیں کھل سکتا۔ یہ کیفیت فقط ان مفکرین کی ہے۔ جن کے خیال میں سنجیدگی اور توافق داخلی پایا جاتا ہے اور زندگی کے متعلق کسی تصور نے ان کی شخصیت پر مکمل قبضہ کر لیا ہے۔ ایسے اشخاص کے تمام افکار بلکہ تمام اعمال ایک رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ میر انیس نے شاعرانہ تعلی میں اپنے متعلق کہا ہے ع

اک رنگ کا مضمون ہو تو سو ڈھنگ سے باندھوں

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر بڑے مفکر اور شاعر کے متعلق یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ایک رنگ کا مضمون سو ڈھنگ سے باندھا ہے۔ اکثر مذہبی کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ کسی ایک مذہب کی تمام تعلیم کا تجزیہ کیجئے تو تہ میں ایک نظریۂ حیات نکلتا ہے۔ جو بعض اوقات دو حرفوں یا دو جملوں میں پورا بیان ہو جاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت اقبال کے ہاں بھی کوئی اس قسم کا اساسی تصور موجود ہے جو اس کے تمام کلام کے لئے بطور کلید کام آسکے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کوئی شاعر تنوع افکار اور ثروت تصورات میں اقبال کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فلسفۂ جدید اور فلسفۂ قدیم، تصوف اسلامی اور غیر اسلامی کے تمام انواع۔ مذاہب عالم

کے گوناگوں تصورات، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی مسائل فکر اور عمل کی تمام قدیم اور جدید تحریکات، ان تمام چیزوں کو اقبال نے اپنی شاعری کے خم میں غوطہ دیکر انسانوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ شاعروں اور دیگر فن کاروں اور حسن کاروں کے متعلق ایک عام خیال ہے کہ ان کو کسی ایک نظریے کا پابند نہیں ہونا چاہئے۔ اگر شاعر کے لئے کوئی نظریہ زنداں بن جائے تو اس کی پرواز محض طائر قفس کی پرواز رہ جائے گی۔ اگر اس نے کسی ایک خیال کا پرچار شروع کر دیا تو وہ شاعر نہیں رہے گا۔ بلکہ واعظ ہو جائے گا۔ اس کا فن تبلیغ کا رنگ اختیار کرلے گا۔ اسی وجہ سے عام طور پر نقادانِ سخن کسی شاعر کے کلام سے کوئی ایک تعلیم۔ کوئی ایک نظریہ حیات یا کوئی ایک پیغام تلاش کرنا اصولاً غلط سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی شاعر کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اسی خیال کے ماتحت ہے۔ نبی کریم صلعم کو مخالف لوگ کبھی مجنوں کہتے تھے اور کبھی شاعر۔ قرآن کریم میں ان دونوں اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے نبی کو مجنوں کہنا اس لئے غلط ہے کہ مجنوں کے اقوال و اعمال بے ربط ہوتے ہیں اور نبی کے اقوال و اعمال میں داخلی اور خارجی موافقت پائی جاتی ہے۔ از روئے قرآن نبی کو شاعر کہنا اس لئے غلط ہے کہ شاعر کی عام کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے۔ اس پر لازماً عمل نہیں کرتا اور اُس کے کہنے کا یہ حال ہے کہ .. ہر چیز کے متعلق مختلف حالات میں مختلف قسم کی باتیں کہتا ہے۔ اس کے تاثرات میں یک رنگی نہیں ہوتی۔ موسم بہار میں خوش ہوتا ہے تو اس کا بیان اس رنگ سے کرتا ہے کہ تمام زندگی بہار ہی بہار ہے۔ عیش ہی عیش ہے مسرت ہی مسرت ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ مست ہے۔ وہ اپنی طبیعت کا [illegible] اور گلشنی رنگ تمام چیزوں پر چڑھا دیتا ہے۔ اسی طرح جب خزاں کا ذکر کرتا ہے تو تمام کائنات کو افسردہ بنا دیتا ہے کہتا ہے کہ ہر چیز فنا کی گرفت میں ہے۔ زندگی ایک ماتم خانہ ہے اور اس کی اصلیت غم جانگداز کے سوا کچھ نہیں۔ زندگی کی وادیاں لاانتہا ہیں۔ اور شاعر تصورات و تاثرات میں ہرزہ گرد ہے۔ اس کا کوئی ایک مقام اور مسکن نہیں فِی کُلِّ وَادٍ یَّہِیْمُوْنَ۔ اس لئے شاعر براہ راست رہنمائی کا کام نہیں کر سکتا۔ جو گروہ شاعر کو مرد عمل سمجھ کر [illegible] میں اس کی پیروی کرے گا وہ یقیناً گمراہ ہو جائے گا۔ اس لئے کہ شاعر کی اگر کوئی معین سمت فکر نہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی کوئی معین سمت عمل بھی نہیں ہو سکتی۔ اقبال کے بعض معاصر شاعر جو اپنے فن میں کمال رکھتے ہیں۔ اقبال کو صحیح معنوں میں شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا اعتراض یہ ہے کہ اقبال نے شاعری سے تعلیم د

تبلیغ اور پیغام رسانی کا کام لینا شروع کر دیا ہے جس سے اس کی شاعرانہ حیثیت کو نقصان پہونچا ہے اُس کے مقابلے میں وہ اپنی آزادی اور بے عنانی کو روح شعریت کی اصلیت سمجھتے ہیں۔ ان نقادوں کو منظر رکھتے ہوئے۔ اقبال نے خود بھی کہنا شروع کر دیا تھا۔ کہ میں شاعر نہیں ہوں اور جو شخص آب و رنگ شاعری کا مجھ سے تقاضا کرتا ہے وہ میرے مقصد کو نہیں سمجھتا۔ طرب آفرینی اور سکون آفرینی اور تخیل میں رنگ بھرنا میرے فن کا مقصود نہیں۔

اگر شاعری فقط بے عنانی تخیل اور تصورات کی ہرزہ گردی کا نام ہے تو ظاہر ہے کہ بعض اکابر شعرا کی نسبت یہ کہنا پڑے گا کہ وہ اصل معنوں میں شاعر نہیں تھے۔ لیکن اصل حقیقت وہ ہے جسے خود ایک شاعر نے ایسے شعرا کی نسبت بیان کیا ہے

شو منکر کہ در اشعار ایں قوم
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

خود قرآن کریم نے عام شعرا کا ایسا صحیح نقشہ کھینچنے کے بعد ان شاعروں کو مستثنیٰ کر دیا ہے جن میں ایمان اور عمل صالح بھی شعریت کے دوش بدوش پایا جائے۔ ایمان اور ذوقِ عمل ایک شاعر کو بھی بے راہ روی سے بچا سکتا ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ خاص حقائق حیات پر اقبال کا ایمان نہایت قوی ہے۔ اقبال بھی مختلف وادیوں میں گھوم سکتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً گھومتا بھی ہے۔ لیکن ایک صراط مستقیم ہے جس پر وہ ہمیشہ پھر پھر کر واپس آجاتا ہے۔ مولانا رُوم کی مثنوی اور اقبال کی شاعری میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ دونوں گلگشت کے لئے اکثر اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں۔ لیکن ہر طرف سے اپنے اصل راستے کی طرف راہ نکال لیتے ہیں۔ اسی قسم کی شاعری ہے جس کو پیغمبری کا جز قرار دیا گیا ہے۔ اور اسی قسم کا شاعر ہے جو تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے۔ مولانا روم کے متعلق کہا گیا ہے کہ ع

نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

اور اقبال کی نسبت بھی گرامی کا یہ مصرعہ مشہور ہے۔ ع

پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) طلوع اسلام ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہو جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالہ ڈاک کیا جاتا ہے

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک دیجئے۔ ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے پہلے آنی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہو جاتا ہے اس مہینہ کے پرچہ کے اندر ایک اطلاع جوابی کارڈ رکھ دیا جاتا ہے جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آنا چاہیئے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچروپیہ معہ محصول ڈاک ہے۔ قیمت فی پرچہ ۸/ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھی جاتی ہے۔

(۷) وی۔ پی طلب کرنے کے بعد اسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھیئے نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمائیے۔

(۹) آپ اپنا تعارف نمبر خریداری کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں اس لئے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ بیحد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) "طلوع اسلام" کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ بلکہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس سے اشتراک عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ وَاللّٰہُ المستعان

(۱۳) نمونہ کے پرچہ کے لئے ۸/ کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

تازہ پرچے کی قیمت ۸/

ناظم:۔

ادارۂ طلوع اسلام دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Tolu-e-Islam Office-Delhi.